ستمبر ۱۹۸۷ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
ہدایت القرآن (۱۷)	مولانا محمد تقی امینی	۳
تاریخ اسلام میں عقل اور نقل کی کشمکش کے دو اہم ادوار	ڈاکٹر اسرار احمد	۷
علیگڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین چند درمیانی راہیں	ڈاکٹر اسرار احمد	۱۷
حکمتِ اقبال (۶)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۳۵
منشورِ اسلام (۶)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۴۹

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اعلان داخلہ قرآن کالج لاہور

گریجویشن کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم حاصل کرنے کا نادر موقع

الحمد للہ کہ اس سال سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام قرآن کالج کے نام سے ایک نئی تعلیمی اسکیم کا آغاز ہو رہا ہے اس اسکیم کے تحت انٹر پاس طلبہ کو تین سال کے عرصے میں جامعہ پنجاب کے نصاب کے مطابق بی اے کے امتحان کی باقاعدہ مناسب تیاری کے ساتھ ساتھ ایک بنیادی دینی نصاب کی تعلیم بھی دی جائے گی جس میں

عربی زبان کی پختہ بنیادوں پر تعلیم اور پورے قرآن کا ترجمہ مع مختصر تشریح

خصوصیت کے ساتھ شامل نصاب ہوں گے۔

★ داخلے شروع ہیں۔ درخواستِ داخلہ جمع کرانے کی آخری تاریخ ۲۰ ستمبر ۸۷ء ہے

نوٹ: پراسپیکٹس اور داخلہ فارم حاصل کرنے کیلئے درج ذیل پتے پر دس روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کریں یا براہ راست حاصل کریں

المعلن: ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن ۸۵۲۶۸۳ ۸۵۲۶۱۱

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماہنامہ حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ : ڈاکٹر محمد رفیع الدّین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ ۔ مرحوم

مدیر اعزازی : ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر : حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

مینجنگ ایڈیٹر : اقتدار احمد

جلد ۶ | ستمبر ۱۹۸۷ء بمطابق محرم الحرام ۱۴۰۸ھ | شمارہ ۹

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ ۔ کے ۔ ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور ۱۴ ۔ فون : ۸۵۲۶۱۱

کراچی آفس : ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بجری ۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون : ۲۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون ۴۰/- روپے فی شمارہ ۴/- روپے

مطبع : آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

اس شمارے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے دو اہم مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ ان میں سے پہلے مضمون میں اسلامی تاریخ میں 'عقل' اور 'نقل' کی قدیم کشمکش کے حوالے سے برصغیر پاک و ہند کے دو متضاد لیکن نمائندہ مکاتبِ فکر یعنی علی گڑھ اور دیوبند کا نہایت جامع انداز میں ایک مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور دوسرے مضمون میں، جو قدرے مفصّل ہے، علم و فکر کے اُن چند درمیانی دھاروں کا ذکر ہے جو اس صدی کے دوران ان انتہاؤں کے مابین سے پھوٹے۔ یہ درمیانی دھارے دراصل علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین حائل خلیج کو پاٹنے کی کوشش کا مظہر ہیں۔ یہ دونوں مضامین جو آج سے بیس برس پہلے سپردِ قلم کئے گئے تھے[1] بنیادی طور پر تجزیاتی نوعیت کے ہیں اور ان کے ذریعے برصغیر کی ماضی قریب کی تاریخ میں قدیم و جدید کی آویزش اور ان میں باہم امتزاج پیدا کرنے کی مساعی کا ایک واضح خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ ان مضامین کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں ماضی قریب کی بعض دینی و علمی شخصیات کی کردار نگاری اس خوبی سے کی گئی ہے کہ ان شخصیات کی علمی و فکری کاوشوں کے ناقدانہ جائزے کے ساتھ ساتھ ان کی مزاجی ساخت اور طبعی میلانات کا ایک بھرپور خاکہ بھی سامنے آتا ہے۔

ہم اس شمارے میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے اُس خط کا عکس بھی شائع کر رہے ہیں جس میں اُنہوں نے محترم ڈاکٹر صاحب کے اِن مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے بھرپور انداز میں تحسین بھی فرمائی ہے اور تصویب بھی۔ اور مولانا کا تبصرہ بلاشبہ ایسا ہے کہ اس کے بعد مزید کوئی تبصرہ کرنا ان مضامین کی وقعت اور قدر و قیمت کو گھٹانے کا باعث تو ہو سکتا ہے، اضافہ کا نہیں!

---

[1] یہ مضامین ۱۹۶۸ء کے دوران ماہنامہ میثاق میں شائع ہوئے تھے۔

مولانا محمد تقی امینی

قوم بنی اسرائیل کی احسان فراموشی و گمراہی

گذشتہ سے پیوستہ

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا[۱] اس کے بعد تم نے بچھڑا بنالیا حالانکہ تم ظالم تھے پھر[۲] اس کے بعد بھی ہم نے معاف کر دیا تاکہ تم شکر کرو۔

[۱] ہونے والے نبیؐ اور رسولؐ کو زمین میں رہتے ہوئے اور انسانی خصوصیتیں برقرار رکھتے ہوئے دوسرے عالم سے تعلق جوڑنا پڑتا ہے وہ عالم اس دنیا سے مختلف ہوتا ہے وہ غیر مادّی ہے اور یہ دنیا مادی ہے اس بناء پر ہر نبیؐ اور رسولؐ کو پہلے ایک خاص قسم کی روحانی تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ دوسرے عالم سے فیض حاصل کرنے اور ہدایت لینے کے قابل بن سکے۔

یہ چالیس دن رات (قمری حساب سے دن شام سے شروع ہوتا ہے غالباً اس بناء پر چالیس دن کے بجائے چالیس راتیں کہی گئیں) اسی تربیت کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ ہوا یہ کہ جب بنی اسرائیل کو فرعونیوں کے ظلم سے نجات ملی اور ان کو آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ تو ان کو دنیا و آخرت کی بھلائی کے لئے قانون و اخلاق اور طریقہ زندگی سب ہی کی ضرورت تھی اللہ نے اس کا انتظام یہ کیا کہ حضرت موسیٰؑ کو پہلے طور پہاڑ پر بلا کر گوشۂ تنہائی میں ان کی تربیت کی وہاں قیام کی مدت تین دن تھی پھر تربیت کی مصلحت سے دس دن اور بڑھا دیئے گئے

[۲] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طُور پر تشریف لے جانے کے بعد بنی اسرائیل نے میدان کو خالی دیکھا تو بچھڑا کی مورتی بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی۔ کافی عرصہ تک بنی اسرائیل مصر میں رہے تھے ان میں گائے پرستی اور بت پرستی کا رواج تھا سمندر پار ہونے کے بعد بھی انہوں نے لوگوں کو بت پرستی کرتے ہوئے پایا تھا ان میں دم ہی کتنا تھا کہ گرد و پیش کی دنیا سے اوپر اٹھ کر اپنے لئے نئی راہ تلاش کرتے اور نئی منزل کی طرف سفر کرتے مصریوں اور فلسطینیوں میں جو کچھ ہوتے دیکھا بس اسی کو اختیار کر لیا اور اتنا بھی صبر نہ کر سکے کہ حضرت موسیٰ طور پہاڑ سے واپس آجائیں۔

گرد و پیش کی دنیا (ماحول) سے متأثر ہونا کوئی نئی بات نہیں قومیں ہمیشہ ایک دوسرے سے متأثر ہوتی

ہیں لیکن وہ قوم جو عرصہ تک پستی کی حالت میں زندگی گزار چکی ہو وہ کس طرح متاثر ہوتی ہے اس کا ذکر بنی اسرائیل کے اس واقعہ میں ہے کہ وہ دوسری قوموں سے صرف رسم ورواج اور چند اوپری باتوں ہی کو نہیں قبول کرتی بلکہ ان باتوں کو بھی قبول کرلیتی ہے جن کا تعلق عقیدہ وعمل کی بنیاد پر ہے اور جن پر قومی اور ملّی وجود قائم ہوتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ایسی قوم جو عرصہ تک پستی کی حالت میں رہتی ہے اس کی زندگی کی قوتوں میں بہت کمی آجاتی ہے وہ نہایت جذباتی اور بے صبری بن جاتی ہے اس میں انتظار اور برداشت کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے آگے کی پائدار تعمیر کی اس کو فکر نہیں ہوتی ہے اور حال کے وقتی فائدہ کو سب کچھ سمجھ لیتی ہے اور پھر بہت جلد اس فائدہ کو حاصل کرنے کے لئے اپنے کو بیچ دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے ایسی حالت میں اس کی اصلاح اور اس کی زندگی میں انقلاب لانے کا کام بے حد مشکل ہوتا ہے ہر وقت اس کے دل کی حرکت پر نظر رکھنے اس کا "بلڈ پریشر" چک کرتے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے

وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ تا هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور فیصلہ کی قوت (فرقان) دی تاکہ تم پر ہدایت کی راہ کھل جائے[1] اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ میری قوم بیشک تم نے بچھڑا بنا کر اپنے ہاتھوں اپنے کو تباہ کیا تو تم اپنے پیدا کرنے والے سے توبہ کرو اور بچھڑا کی پرستش کے بدلہ اپنی جانوں کو قتل کرو تمہارے لئے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک یہی بہتر ہے بیشک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے [۲]

[1] اللہ نے فرعون کی غلامی سے آزادی کے بعد بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لئے حضرت موسیٰ کو کتاب (تورات) دی جس میں قانون اخلاق اور طریقہ زندگی سبھی کچھ تھے اور فیصلہ کی قوت وہی جیسکی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے کے لئے ان کمیوں سے واقف ہونے کے لئے جو غلامی اور پستی کے زمانہ میں پیدا ہو گئی تھیں اور پھر ان سب کے پیش نظر ان کی تربیت کا پروگرام طے کرنے کے لئے بڑی شدید ضرورت تھی۔

فرقان (فیصلہ کی قوت) کا خاص طور سے اس بناء پر ذکر کیا کہ بنی اسرائیل میں قوت فیصلہ کی بڑی کمی تھی جیسا کہ آگے گائے ذبح کرنے کا واقعہ آرہا ہے جس میں ان کے سوالات سے ظاہر ہوتا ہے مثلاً اس کا رنگ کیسا ہو اس کی عمر کیا ہو جوان ہو یا بوڑھی ہو زمین جوتنے یا سیراب کرنے کا کام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔ اسی طرح ان کی زندگی کے دوسرے واقعات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں قوتِ فیصلہ کی بڑی کمی تھی۔

۲ بنی اسرائیل کو دنیا جہان میں جو بلند و برتر مقام عطا ہونے والا تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی دنیا جہان والوں پر فضیلت اس کی مناسبت سے تربیت ضروری تھی۔ ظاہر ہے کہ تربیت کا زمانہ سخت ہوتا ہے اس میں بڑی آزمائشیں ہوتی ہیں اور سخت قسم کے قوانین سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ قوانین اگرچہ عارضی ہوتے ہیں لیکن تربیت کے کورس میں ان کے بغیر چارہ نہیں ہوتا ہے اس بلند و برتر مقام کے لئے جس قسم کی تربیت ضروری ہوتی ہے اس کو سمجھنے میں صحابہ کرامؓ کی کلی زندگی سے مدد ملے گی۔ تربیت کے پروگرام کا ایک حصہ اضطراری یعنی اللہ کی طرف سے ہوتا ہے جس سے چار و ناچار گزرنا پڑتا ہے اور ایک حصہ اختیاری ہوتا ہے یعنی اس کا حکم دیا جاتا ہے جس میں کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے لیکن اس کو کئے بغیر تربیت کی بات نہیں پوری ہوتی ہے۔ بچھڑے کی پرستش کے بدلہ جانوں کو مارنے کا حکم اختیاری تھا اور یہ جانچنے کے لئے تھا کہ لوگوں کو اپنے فعل پر واقعی شرمندگی ہے یا صرف زبانی شرمندگی ہے۔ اگر صرف زبانی توبہ کو کافی سمجھا جاتا اور عملی توبہ کی یہ شکل نہ تجویز کی جاتی تو ایک طرف اندرونی زندگی میں وہ تبدیلی نہ ہوتی جو اس سے مقصود تھی اور دوسری طرف توبہ کی اہمیت گھٹ جاتی۔ جس قوم کو اللہ نے ایسے معجزانہ انداز میں چند ہی دن پہلے سمندر سے پار کیا اور اس کے دشمن کو نیست و نابود کر دیا وہی قوم قدرت کے فیصلہ کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے بغاوت و سرکشی پر اتر آئی ظاہر ہے کہ اس کے زبانی توبہ کی کیا حیثیت ہو گی؟ پھر ایسا نہیں ہوا بچھڑے کی پرستش کرنے والے تمام لوگوں کو ان لوگوں نے قتل کیا ہو۔ جنہوں نے پرستش نہیں کی تھی بلکہ کچھ لوگوں کے قتل کے بعد جب اندازہ ہو گیا کہ واقعی ان کو اپنے فعل پر شرمندگی ہے تو بقیہ لوگوں کو اللہ نے معاف کر دیا اور ان کی توبہ قبول کر لی جس کا ذکر اوپر کی آیت ثُمَّ عَفَوْنَا (پھر ہم نے معاف کر دیا) میں اور اس آیت فَتَابَ عَلَيْكُمْ (اللہ نے تمہاری توبہ قبول کی) میں موجود ہے۔

قتل کا یہ واقعہ تورات میں ہے بنی اسرائیل کی تاریخ میں مشہور ہے مفسرین نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کے باوجود قتل کو اصلی معنی سے ہٹا کر اس کے معنی ریاضت و مجاہدہ یا نفس کشی کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے جیسا کہ نئے زمانہ کے بعض مفسرین نے کہا ہے۔

اصل غلطی قومی و جماعتی زندگی اور اس کے تربیتی پروگرام کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ طبیعت کی سختی و نرمی سمجھ کی بلندی و پستی اور عقل میں کمی و بیشی کے لحاظ سے پہلی قوموں کو بالکل ویسا ہی سمجھ لیا جاتا ہے جیسا کہ آج کی قومیں ہیں پھر ان کی مناسبت سے جو تربیتی پروگرام تجویز ہوتا ہے آج کی قوموں کے وہ مناسب نہیں نظر آتا ہے تو اس کا انکار کر دیا جاتا ہے اور پھر عذر و معذرت کی وہ روش اختیار کی جاتی ہے جس سے خود اپنی پستی اور اپنے ذہن و فکر کے زوال کا پتہ چلتا ہے۔ ☆ ☆

ہیں لیکن وہ قوم جو عرصہ تک پستی کی حالت میں زندگی گزار چکی ہو وہ کس طرح متاثر ہوتی ہے اس کا ذکر بنی اسرائیل کے اس واقعہ میں ہے کہ وہ دوسری قوموں سے صرف رسم ورواج اور چند اوپری باتوں ہی کو نہیں قبول کرتی بلکہ ان باتوں کو بھی قبول کرلیتی ہے جن کا تعلق عقیدہ وعمل کی بنیاد پر ہے اور جن پر قومی اور ملّی وجود قائم ہوتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ ایسی قوم جو عرصہ تک پستی کی حالت میں رہتی ہے اس کی زندگی کی قوتوں میں بہت کمی آجاتی ہے وہ نہایت جذباتی اور بے صبری بن جاتی ہے اس میں انتظار اور برداشت کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے آگے کی پائدار تعمیر کی اس کو فکر نہیں ہوتی ہے اور حال کے وقتی فائدہ کو سب کچھ سمجھ لیتی ہے اور پھر بہت جلد اس فائدہ کو حاصل کرنے کے لئے اپنے کو بیچ دینے پر آمادہ ہوجاتی ہے ایسی حالت میں اس کی اصلاح اور اس کی زندگی میں انقلاب لانے کا کام بے حد مشکل ہوتا ہے ہر وقت اس کے دل کی حرکت پر نظر رکھنے اس کا "بلڈ پریشر" چک کرتے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے

وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ تا ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور فیصلہ کی قوت (فرقان) دی تاکہ تم پر ہدایت کی راہ کھل جائے اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ میری قوم بیشک تم نے بچھڑا بنا کر اپنے ہاتھوں اپنے کو تباہ کیا تو تم اپنے پیدا کرنے والے سے توبہ کرو اور بچھڑا کی پرستش کے بدلہ اپنی جانوں کو قتل کرو تمہارے لئے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک یہی بہتر ہے بیشک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے ۳

[۱] اللہ نے فرعون کی غلامی سے آزادی کے بعد بنی اسرائیل کی رہنمائی کے لئے حضرت موسیٰ کو کتاب (تورات) دی جس میں قانون اخلاق اور طریقہ زندگی سبھی کچھ تھے اور فیصلہ کی قوت دی جیسکی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو سمجھنے کے لئے ان کمیوں سے واقف ہونے کے لئے جو غلامی اور پستی کے زمانہ میں پیدا ہوگئی تھیں اور پھر ان سب کے پیش نظر ان کی تربیت کا پروگرام طے کرنے کے لئے بڑی شدید ضرورت تھی۔

فرقان (فیصلہ کی قوت) کا خاص طور سے اس بناء پر ذکر کیا کہ بنی اسرائیل میں قوت فیصلہ کی بڑی کمی تھی جیسا کہ آگے گائے ذبح کرنے کا واقعہ آرہا ہے جس میں ان کے سوالات سے ظاہر ہوتا ہے مثلاً اس کا رنگ کیسا ہو اس کی عمر کیا ہو جوان ہو یا بوڑھی ہو زمین جوتنے یا سیراب کرنے کا کام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔ اسی طرح ان کی زندگی کے دوسرے واقعات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں قوتِ فیصلہ کی بڑی کمی تھی۔

ے بنی اسرائیل کو دنیا جہان میں جو بلند و برتر مقام عطا ہونے والا تھا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے یعنی دنیا جہان والوں پر فضیلت' اس کی مناسبت سے تربیت ضروری تھی۔ ظاہر ہے کہ تربیت کا زمانہ سخت ہوتا ہے اس میں بڑی آزمائشیں ہوتی ہیں اور سخت قسم کے قوانین سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ قوانین اگرچہ عارضی ہوتے ہیں لیکن تربیت کے کورس میں ان کے بغیر چارہ نہیں ہوتا ہے اس بلند و برتر مقام کے لئے جس قسم کی تربیت ضروری ہوتی ہے اس کو سمجھنے میں صحابہ کرامؓ کی مکی زندگی سے مدد ملے گی۔ تربیت کے پروگرام کا ایک حصہ اضطراری یعنی اللہ کی طرف سے ہوتا ہے جس سے چار و ناچار گزرنا پڑتا ہے اور ایک حصہ اختیاری ہوتا ہے یعنی اس کا حکم دیا جاتا ہے جس میں کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے لیکن اس کو کئے بغیر تربیت کی بات نہیں پوری ہوتی ہے۔ بچھڑے کی پرستش کے بدلہ جانوں کو مارنے کا حکم اختیاری تھا اور یہ جانچنے کے لئے تھا کہ لوگوں کو اپنے فعل پر واقعی شرمندگی ہے یا صرف زبانی شرمندگی ہے۔ اگر صرف زبانی توبہ کو کافی سمجھا جاتا اور عملی توبہ کی یہ شکل نہ تجویز کی جاتی تو ایک طرف اندرونی زندگی میں وہ تبدیلی نہ ہوتی جو اس سے مقصود تھی اور دوسری طرف توبہ کی اہمیت گھٹ جاتی۔ جس قوم کو اللہ نے ایسے معجزانہ انداز میں چند ہی دن پہلے سمندر سے پار کیا اور اس کے دشمن کو نیست و نابود کر دیا وہی قوم قدرت کے فیصلہ کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے بغاوت و سرکشی پر اتر آئی ظاہر ہے کہ اس کے زبانی توبہ کی کیا حیثیت ہو گی؟ پھر ایسا نہیں ہوا بچھڑے کی پرستش کرنے والے تمام لوگوں کو ان لوگوں نے قتل کیا ہو۔ جنہوں نے پرستش نہیں کی تھی بلکہ کچھ لوگوں کے قتل کے بعد جب اندازہ ہو گیا کہ واقعی ان کو اپنے فعل پر شرمندگی ہے تو بقیہ لوگوں کو اللہ نے معاف کر دیا اور ان کی توبہ قبول کر لی جس کا ذکر اوپر کی آیت ثُمَّ عَفَوْنَا (پھر ہم نے معاف کر دیا) میں اور اس آیت فَتَابَ عَلَيْكُمْ (اللہ نے تمہاری توبہ قبول کی) میں موجود ہے۔

قتل کا یہ واقعہ تورات میں ہے بنی اسرائیل کی تاریخ میں مشہور ہے مفسرین نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں اس کا ذکر کیا ہے' اس کے باوجود قتل کو اصلی معنی سے ہٹا کر اس کے معنی ریاضت و مجاہدہ یا نفس کشی کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے جیسا کہ نئے زمانہ کے بعض مفسرین نے کہا ہے۔

اصل غلطی قومی و جماعتی زندگی اور اس کے تربیتی پروگرام کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ طبیعت کی سختی و نرمی سمجھ کی بلندی و پستی اور عقل میں کمی و بیشی کے لحاظ سے پہلی قوموں کو بالکل ویسا ہی سمجھ لیا جاتا ہے جیسا کہ آج کی قومیں ہیں پھر ان کی مناسبت سے جو تربیتی پروگرام تجویز ہوتا ہے آج کی قوموں کے وہ مناسب نہیں نظر آتا ہے تو اس کا انکار کر دیا جاتا ہے اور پھر عذر و معذرت کی وہ روش اختیار کی جاتی ہے جس سے خود اپنی پستی اور اپنے ذہن و فکر کے زوال کا پتہ چلتا ہے۔ ☆ ☆

فہمِ قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربُوط مطالعے کے ضمن میں —

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن مجید کی سُورتوں کا اجمالی تجزیّہ

(سورہ الفاتحہ تا سورہ الکہف)

ضرور مطالعہ کیجیے

◎

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ کتابت ○ دیدہ زیب طباعت

ہدیہ : ۱۲ روپے

ڈاکٹر اسرار احمد

اسلام کی تاریخ میں
عقل اور نقل کی کشمکش
کے دو اہم دور ـــــ اور
برصغیر میں علی گڑھ اور دیوبند کے دو متضاد مکاتبِ فکر کا قیام

اسلام کی تاریخ میں عقل اور نقل کا نزاع تقریباً ابتداء ہی سے چلا آ رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ "مذہب" اپنی اصل کے اعتبار سے "نقل" ہے جو اولاً فرشتے کی وساطت سے خدا سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو منتقل ہوا اور پھر ان کی ذات گرامیؐ سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے لہٰذا اس کی اساس "نقل" پر ہے نہ کہ "عقل" پر ..... لیکن ظاہر ہے کہ اس کے مخاطب انسان ہیں جو چاہے تمام کے تمام "ذوی العقول" نہ ہوں۔ لیکن پیروی چونکہ وہ اپنی اسی اقلیت کی کرتے ہیں جو "ذی العقل" ہوتی ہے لہٰذا انسان پر بحیثیت مجموعی حیوانِ عاقل کا اطلاق غلط نہیں ہے۔ بنابریں یہ ایک بالکل فطری بات ہے کہ بالکل ابتداء ہی سے مذہب کے "نقل" کو "عقل" پر پرکھنے اور اس کی عقلی توجیہہ کرنے کی کوششیں ہوتی چلی آئی ہیں اور اس کے نتیجے میں ہر دور کی عقلی و فکری سطح کے مطابق علمِ کلام کا ذخیرہ تیار ہوتا رہا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معاملہ دوسرا تھا۔ انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی براہ راست صحبت کی بدولت جو ایمان حاصل ہوا تھا وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل منفرد ہے اور کسی غیر صحابی کے ایمان کو اس پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ انہیں علم الیقین ہی نہیں حق الیقین کی جو کیفیت حاصل تھی اس میں استدلال کا عنصر اول تو تھا ہی بہت کم، اور جتنا تھا اس کی اساس بھی فطرت کے نہایت محکم لیکن سادہ دلائل پر تھی نہ کہ کسی

پیچ در پیچ منطقیانہ قیل و قال پر یہی وجہ ہے کہ یہ بات بالکل غیر مبہم طریق پر واضح کر دی گئی ہے کہ امت کے کسی بڑے سے بڑے ولی کا ایمان بھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابیؓ کے ایمان کو نہیں پہنچ سکتا۔ ان کے قلوب جس نورِ ایمان سے منور تھے اور ان کے سینے جس حرارتِ ایمانی سے معمور تھے ان کا مقابلہ کسی دوسرے شخص کا "دلِ روشن" اور "نفسِ گرم" نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ایمان نے ایک ایسے بے تابانہ جذبے اور والہانہ عشق کی صورت اختیار کر لی تھی جو ہر دم عمل کی بھٹیوں اور آزمائشوں اور ابتلاؤں کے الاؤں میں کودنے کو اس طرح آمادہ و تیار رہتا ہے کہ عقل بے چاری کے لئے "محو تماشائے لبِ بام" رہنے کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہیں رہتا۔[1]

دورِ صحابہؓ کے اختتام کے ساتھ ہی فطری طور پر ایمان کی ان کیفیات میں انحطاط و اضمحلال پیدا ہونا شروع ہو گیا اور "عشق کی آگ" ٹھنڈی پڑنی شروع ہو گئی۔ نتیجۃً فوراً عقل کے قیل و قال کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہ آج تک جاری ہے۔ اس عرصے میں "عقل" پر کئی دور آئے اور ہر دور میں اس کے صغریٰ و کبریٰ بدلتے رہے، لیکن مذہب کے "نقل" کے ساتھ اس کا تصادم مسلسل جاری رہا۔ اور یہ پینترے بدل بدل کر اس پر حملہ آور ہوتی رہی۔ دوسرے طرف سے حامیان و حاملانِ نقل اس کی جانب سے مدافعت کرتے رہے اور اس طرح اسلام کی پوری تاریخ میں عقل اور نقل کے باہمی نزاع کا سلسلہ چلتا رہا۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ مذہب کے نقل کی کامل عقلی توجیہہ نہ کبھی ہوئی ہے نہ ہو سکے گی اس کی وجہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ عقل انسانی نہایت محدود ہے اور زمان و مکان اور ظروف و احوال کے بہت سے بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے جبکہ دین و مذہب کی اساس جن

---

[1] یہ وہ 'محالِ عقلی' ہے جس کا منطقی امکان اگر کوئی ہے تو صرف اس وقت جب علمِ انسانی ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں اس کے لئے حقیقتِ نفس الامری بالکل کھل جائے اور حقائقِ اشیاء بالکل 'کما ھی' روشن ہو جائیں..... اور ظاہر ہے کہ یہ صرف آخرت میں ہو سکے گا۔!!

[2] اسی کی ایک ادنیٰ مثال ہے حضرت خالدؓ کا وہ قول جو انہوں نے غیر مسلم افواج سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ "لوگو! تمہارا سابقہ اس قوم سے ہے جو موت کو اسی قدر عزیز جانتی ہے جس قدر تم زندگی کو!"

وراء الوراء حقائق پر ہے وہ غیر محدود بھی ہیں اور نہایت لطیف بھی..... شریعت کے اوامر و نواہی کے اسرار و حکم کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس میدان میں عقل اپنی جولانیاں جتنی چاہے دکھالے' ایمانیات و اعتقادات کی سرحد شروع ہوتے ہی معاملے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایمان جن غیر محدود' لطیف اور وراء الوراء حقائق کے مجموعے کا نام ہے ان کا مجرد نطق انسانی کی گرفت میں آنا بھی نہایت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے' (تبھی تو اس مقام پر خود آسمانی کتابوں کو بھی اشاروں' کنایوں' استعاروں اور تمثیلوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے!) ..... کجا یہ کہ انہیں ہر دور کی عقلی سطح پر وقت کے فلسفہ و منطق کے غایت درجہ محدود سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے!!

چنانچہ..... یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ عقائد اسلامی کی عقلی توجیہہ کی کوششوں سے بعض اوقات شدید نقصان بھی پہنچا۔ وقت کے فلسفوں کی کسوٹی پر پرکھنے میں کبھی کبھی دین و مذہب کے بعض حقیقی اجزاء کو کھوٹا بھی سمجھ لیا گیا اور وقت کی منطق کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش میں کبھی کبھی دین و مذہب کے بعض پہلو مجروح بھی ہوئے.....

اس کے مقابلے میں "محفوظ" راستہ ہمیشہ ان ہی کا رہا جنہوں نے محض نقل پر اکتفا کیا۔ اسی کو سینے سے لگائے رکھا' اسی کے تحفظ میں زندگیاں کھپا دیں اور اسے جوں کا توں اگلی نسل تک منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے..... بایں ہمہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا چونکہ مذہب کے نقل کی عقلی توجیہہ ایک ناگزیر انسانی ضرورت ہے لہٰذا ہر دور میں دین و مذہب کے مخلصین اس کے لئے کوشاں رہے اور خود اپنے دین و ایمان کے لئے خطرات مول لے کر بھی اس خطرناک مہم کو سر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ بات بالکل واضح طور پر پیش نظر رہنی چاہئے کہ ایسے لوگوں کی ان تمام کوششوں کا اصل محرک نُصح و نصرت دین ہی کا جذبہ تھا۔ ان کے بارے میں یہ گمان کہ وہ دین و مذہب کے دشمن تھے یا ان کا مقصد ہی اسلام کو گزند پہنچانا تھا ایک شدید قسم کی زیادتی و ناانصافی ہے!

اصحابِ نقل کی جانب سے فطری طور پر ہر دور میں اصحاب عقل پر نکیر بھی ہوتی رہی لیکن اس کی بھی ہمیشہ دو سطحیں رہیں۔ ایک عوامی سطح جس پر مجرد ردّ و انکار اور اصحاب عقل کی

موشگافیوں سے بیزاریٔ محض کا اظہار ہوتا رہا اور دوسرے علمی سطح پر، ایسے لوگوں کے ذریعے جنہوں نے اپنے دور کے فلسفہ و منطق، علوم و فنون اور افکار و نظریات کے چشموں سے پوری طرح سیراب ہو کر اور اس طرح وقت کے عقلی معیار پر کاملاً پورے اُتر کر..... اور پھر خود ذہنی و عقلی اور قلبی و روحانی ہر اعتبار سے مذہب کے نقل پر مطمئن ہو کر اصحابِ عقل پر مدلّل تنقید کی۔ درحقیقت دین و مذہب کا اصل دفاع ہر دور میں ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں ہوا۔ اس لئے کہ لوہا لوہے ہی سے کاٹا جا سکتا ہے اور عقل کا توڑ عقل ہی کے ذریعے ممکن ہے!

☆ ☆ ☆

دورِ اوّل۔ اسلام کی تاریخ میں "عقل" اور "نقل" کا پہلا نزاع اس وقت برپا ہوا جب اسلام کے اصحابِ عقل نے یونان کے فلسفے اور ارسطو کی منطق کے زیر اثر اسلام کی عقلی توجیہہ کی کوششیں شروع کیں اور اس کے نتیجے میں اسلام کے اساسی ایمانیات و اعتقادات کے ضمن میں منطقی موشگافیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ عقل و نقل کی وہ جنگ شروع ہوگئی جس کا آغاز تو اگرچہ دورِ اُموی کے آخری زمانے میں ہو گیا تھا لیکن جو اپنے پورے شباب کو دور عباسی میں پہنچی۔ اس جنگ میں اوّل اوّل دو بالکل انتہائی نقطہ ہائے نظر پیدا ہوئے جو ایک دوسرے کی کامل ضد تھے۔ چنانچہ "عقل خالص" نے معتزلہ کا روپ دھارا اور "نقل محض" نے اصحاب ظاہر کی صورت اختیار کی، لیکن رفتہ رفتہ اس "آویزش" میں "آمیزش" کا رنگ بھی پیدا ہونا شروع ہوا جس کے نتیجے میں معتدل نظام ہائے اعتقادی وجود میں آئے اور اشعری و ماتریدی عقائد باقاعدہ مرتّب و مدوّن ہوئے اور عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت نے ان کے گوشۂ عافیت میں پناہ لی۔ خالص علمی سطح پر یہ نزاع بعد میں بھی جاری رہا اور امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہؒ ایسے اصحابِ فکر و نظر عقلیت پرستی پر شدید "عقلی" ضربیں لگا کر "نقل" کے دفاع کا موثر بندوبست کرتے رہے۔

اس سلسلے میں دو باتیں خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ معتزلہ اور اصحاب ظاہر کے تصادم کے نتیجے میں جو معتدل "مسلکِ اہلِ سنت" اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نظام ہائے اعتقادی کی صورت میں ظاہر ہوا اُس کا اصل تانا بانا بھی وقت کے فلسفہ و منطق ہی سے تیار ہوا ہے جس میں ایمان کے لازوال اور ابدی حقائق خوبصورتی کے ساتھ بُن دیئے گئے ہیں۔ گویا کہ اسے عقل اور نقل کا ایک حسین امتزاج قرار تو دیا جا سکتا ہے لیکن اِن تصریحات کے ساتھ

کہ ایک تو اس میں اس مئے حقیقت کو جو لازوال ولافانی اور ازلی وابدی ہے عقل و منطق کے اُن پیمانوں میں پیش کیا گیا ہے جو بالکل عارضی اور وقتی ہیں، دائمی و مستقل نہیں اور دوسرے یہ کہ یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ ان عقائد کے منطقی و کلامی طرز بیان میں "حقیقت ایمان" بتمام و کمال سمودی گئی ہے۔

ان عقائد کو بھی زیادہ سے زیادہ ایک خاص دور کی عقلی سطح پر اور اس وقت کے متداول منطقی اصطلاحات میں "حقائق ایمان" کی امکانی حد تک ترجمانی قرار دیا جاسکتا ہے اور بس!

دوسرے یہ کہ اس وقت بھی مذہب کا دفاع اور عقل و نقل کا یہ امتزاج صرف ایسے لوگوں کے ذریعے ممکن ہو سکا تھا جو بیک وقت صاحب عقل بھی تھے اور حامل نقل بھی۔ بالکل یک رخے لوگ اس کام کے لئے اس وقت بھی بے کار تھے۔ چنانچہ "تہافت الفلاسفہ" کے مصنفؒ خود ایک بہت بڑے فلسفی تھے۔ اور "الرد علی المنطقیین" کے مولفؒ خود ایک بہت بڑے منطقی تھے۔ کسی ایسے شخص کے لئے جو خود وقت کے فلسفہ و منطق کی گہرائیوں میں اترا ہوا نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ ان کی گمراہی و کج فہمی کی جڑوں پر مؤثر تیشہ چلا سکے۔

دورِ ثانی ۔ اسلام پر عقلیت کا دوسرا بڑا حملہ آج سے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال قبل یورپ کے اس فلسفہ و فکر کے زیر اثر شروع ہوا جس کی تعمیر خالص مادہ پرستی کی اساس پر ہوئی تھی۔ برصغیر ہندو پاک میں یہ جدید "مذہبی عقلیت" متعدد اہلِ فکر و نظر اور صاحبانِ قلم و قرطاس کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ جس میں جسٹس امیر علی کا نام بھی اگرچہ بالکل غیر اہم نہیں، تاہم ہر اعتبار سے اہم ترین نام سرسید احمد خاں مرحوم کا ہے۔ فکر اسلامی کے اس دور میں ان حضرات کا مقام بالکل وہی ہے جو دور قدیم میں اولین معتزلہ کا تھا۔ یعنی مذہب کے نقل کے مقابلے میں عقل کی بالکل دوسری انتہا پر!

سرسید مرحوم کا ملت اسلامی کے ساتھ اخلاص تو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے ہی واقعہ یہ ہے کہ ان کے مذہب کے ساتھ مخلصانہ تعلق میں شک کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ..... نماز روزے کے معاملے میں وہ متشدد "وہابی" تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انہیں ایسا والہانہ تعلق خاطر تھا کہ جب ۶۴-۱۸۵۸ء میں سر ولیم میور کی کتاب "حیاتِ محمدؐ" شائع ہوئی۔ جس میں آنحضورؐ کی سیرت مبارکہ پر رکیک حملے کئے گئے تھے تو وہ سخت بے چین

اور مضطرب ہوگئے اور بقول اُن کے ان کا "جگر خون ہو گیا" اور انہوں نے لندن سے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ "میں اس کا جواب لکھ رہا ہوں اس کی اشاعت کے لئے رقم کی ضرورت ہوگی، تم اول تو راجہ جے کشن داس سے قرض حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ورنہ میری علی گڑھ والی کوٹھی فروخت کر دو!"..... بایں ہمہ ان پر مغربی علوم و فنون اور خاص طور پر جدید سائنس کا ایسا رعب تھا اور مادّہ پرستانہ نقطہ نظر ان پر اس قدر غالب آگیا تھا کہ ان کی عینک سے جب انہوں نے دین و مذہب کا مطالعہ کیا تو اس کی بہت سی چیزیں انہیں ایسی نظر آئیں جن کو "ماننے" کے بعد اہل مغرب سے آنکھیں چار کرنا ان کے نزدیک دشوار تھا۔ چنانچہ دین و مذہب کی خیر خواہی انہیں اسی میں نظر آئی کہ ایسی چیزوں کی حتی الامکان تو عقلی و سائنٹفک توجیہہ کر دی جائے اور جن چیزوں کی توجیہہ کسی طرح ممکن نہ ہو، ان کا انکار کر دیا جائے۔

چنانچہ ملائکہ محض قوائے طبعیہ (FORCE OF THE NATURE) قرار پائے۔ جن انسانوں ہی میں سے اجڈ، گنوار اور مشتعل مزاج لوگ ٹھہرے، معجزات کی خالص طبعی (PHYSICAL) توجیہہ ہوئی۔ جنت اور دوزخ کو مقامات (PLACES) نہیں بلکہ صرف کیفیات (STATES) قرار دیا گیا۔ مذہبی رواداری کا راگ الاپا گیا۔ اور جہاد کے بارے میں معذرت خواہانہ روش اختیار کی گئی۔ دنیوی ترقی و عروج نظریات و افکار کی صحت کے ثبوت گردانے گئے اور مغربی تہذیب و تمدن اور طرز بود و باش کو مسلمانوں کے جملہ قومی و ملی امراض کا واحد علاج..... اور ان کے عروج و ترقی کا واحد ذریعہ قرار دیا گیا..... چنانچہ بالکل صاف کہا گیا کہ "مذہب کے علاوہ ہر بات میں انگریز بن جاؤ!"..... اور نوبت بایں جا رسید کہ خود خدا کا تصور بھی حیّ و قیوم، سمیع و بصیر، رحیم و کریم، صاحب ارادہ و مشیت اور غفور و منتقم ہستی کے بجائے سائنس کے علت العلل[1] (THE FIRST CAUSE) کی صورت اختیار کر گیا..... اور وحی و قرآن کے بارے میں جو تصور اختیار کیا گیا اور "بے چارے" جبریل امینؑ کو جس طرح بیک بینی و دو گوش "رخصت" کیا گیا وہ اس شعر سے ظاہر ہے کہ ؎

---

[1] واضح رہے کہ علّت العلل اور مسبّب الاسباب میں زمین آسمان کا فرق ہے

زجبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتار معشوقؔ[1] است قرآنے کے من دارم!

گویا "مذہب" کی مکمل قلب ماہیت ہوگئی اور ہماری اپنی وضع کردہ اصطلاح کے مطابق مذہب کا خالص "غیر مذہبی" "ایڈیشن" تیار ہوگیا..... بالکل ٹھیک کہا تھا حضرت اکبر الہ آبادی نے کہ ؎

دیکھ کاریگری حضرتِ سیّد اے شیخ
دے گئے لوچ وہ مذہب میں کمانی کی طرح

ہم نے سید مرحوم کی جدید مذہبی عقلیت کے چند شاہکار اس لئے پیش کر دیئے تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ آج کی تمام نام نہاد مذہبی عقلیت خواہ وہ پرویزیت کی صورت میں ظاہر ہوئی ہو خواہ فضل الرحمانیت کی شکل میں درحقیقت فکرِ سرسیّد ہی کی خوشہ چینی اور نہایت کورانہ تقلید ہے۔ سرسید بے چارے تو پھر بھی معذور تھے اس لئے کہ ان کا واسطہ ایک ابھرتی ہوئی فکر کے ساتھ تھا جس کی پشت پر ایک عظیم سیاسی و عسکری قوت بڑی شان و شوکت اور آب و تاب کے ساتھ ابھر رہی تھی۔ رحم تو آتا ہے ان کے ان جدید متبعین پر جو آج ان نظریات کو بڑے فخر کے ساتھ پیش فرما رہے ہیں درآنحالیکہ مغربی تہذیب کبھی کی "خود اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی" کر چکی، سائنس کی مادہ پرستی کب کی فضا میں تحلیل ہو چکی، اور مغرب کی سیاسی و عسکری بالادستی کی بساط کب کی تہہ ہو چکی۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بو العجبی ست!

بہرحال اصل اہمیت سرسید کی نہیں فکر سید کی ہے۔ شخص سرسید تو بہت جلد اپنے رب سے جاملا لیکن فکر سرسید دراصل تاریخ اسلامی کا ایک دور ہے جو تاحال جاری ہے۔ سرسید مرحوم نے جو پودا علی گڑھ کی صورت میں لگایا تھا وہ ان کے بعد ایک تناور درخت بنا اور خوب برگ و بار لایا۔ برصغیر میں قائم ہونے والے تمام اسلامیہ کالجوں اور اسلامیہ ہائی سکولوں کا

---

[1] اس شعر میں 'معشوق' کا اطلاق جس طرح آنحضورؐ پر بھی ہوسکتا ہے اور خدا پر بھی بالکل اسی طرح کا قول ہے ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کا کہ "قرآن سارے کا سارا ایک وقت خدا کا کلام بھی ہے اور کلامِ رسولؐ بھی"..... دونوں جگہوں پر اصل انکار جبریل امینؑ کا ہے.....!

تعلق علی گڑھ سے وہی ہے جو روئے زمین کی تمام مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ پاک وہند کے تمام جدید تعلیم یافتہ عناصر شعوری طور پر اسی مکتبۂ فکر سے متعلق ومنسلک ہیں جس کی ابتداء سرسید مرحوم نے کی تھی۔

متذکرہ بالا جدید مذہبی عقلیت کے مقابلے میں اسلام کے نقل کے دفاع کا سب سے بڑا مرکز دیوبند بنا۔ جس نے قال اللہ وقال الرسول کے حصار میں محصور ہو کر مذہب کا تحفظ کیا اور اس قوم میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ دیوبند ایک درسگاہ و دارالعلوم ہی نہیں ایک عظیم تحریک ہے جس نے اس دور میں دین ومذہب کی حفاظت کا موثر رول ادا کیا اور جس سے متعدد علمی وعملی سوتے پھوٹے۔ چنانچہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے بعد شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کاسمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مجاہد حریت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مبلغ ملت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کے تمام علمی وروحانی، مذہبی وسیاسی اور دعوتی وتبلیغی سلسلوں کا اصل منبع دیوبند ہی ہے۔ حتیٰ کہ اوپر ہی کی مثال کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی اکثر دینی درسگاہوں اور دینی ومذہبی تحریکوں کا تعلق بھی دیوبند کے ساتھ وہی ہے جو دنیا بھر کی مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ اور برصغیر کے مذہبی عناصر میں سے صرف ان کو چھوڑ کر جن کی مذہبیت بس عرس ومیلاد اور فاتحہ ودرود تک محدود ہے بقیہ تمام فعال مذہبی عناصر تحریک دیوبند ہی کی مختلف شاخوں سے متعلق ومنسلک ہیں۔

تحریک دیوبند کی ان مختلف شاخوں کے مابین مجموعی مزاج اور دائرہ ہائے کار کا فرق وامتیاز بھی ایک دلچسپ علمی موضوع ہے۔ ان میں اصل عوامی عنصر جو مذہب وسیاست دونوں کا مظہر یا بالفاظ دیگر مذہبی سیاست کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ ذہناً وقلباً "حسینی" ہے یعنی مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ذہنی تعلق اور قلبی ارادت وعقیدت رکھتا ہے۔ مجلس احرار اسلام بھی درحقیقت اسی کا تتمہ یا صحیح تر الفاظ میں ضمیمہ ہے۔ تھانوی اور عثمانی حلقے علمی ذوق اور متصوفانہ مزاج کے حامل ہیں۔ مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے تلمیذ رشید مولانا یوسف بنوری کا مزاج خالص علمی ہے..... اور تبلیغی جماعت خالص غیر سیاسی وغیر علمی لیکن نہایت پرجوش وفعال مذہبیت کا مظہر ہے..... ان تمام امتیازات کے علی الرغم جہاں تک مذہبی فکر کا تعلق ہے وہ ان سب میں مشترک ہے۔ مذہب کے نقل کے یہ سب ایک سے فدائی ہیں۔ اور

قال اللہ و قال الرسولؐ ہی نہیں اس کی بھی ایک متعین صورت یعنی مسلک حنفی کے سب کے سب یکساں شیدائی ہیں۔ عقل کا مصرف ان سب کے نزدیک بس ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قرآن و سنت کا معروضی (OBJECTIVE) مطالعہ کرے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ شریعت کے اوامر و نواہی کے اسرار و حکم کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اور سب سے بڑا علمی مشغلہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ اشعری و ماتریدی عقائد اور فقہ حنفی کے لئے کچھ بس پڑ سکے تو عقلی بھی ورنہ زیادہ تر نقلی دلائل فراہم کئے جائیں..... دوسری طرف جدید علوم و فنون سے یہ بالکل کورے ہیں۔ جدید سائنس کی انہیں ہوا تک نہیں لگی اور طبیعات، کیمیا، فلکیات، حیاتیات اور نفسیات کے میدان میں انسان نے اپنے مشاہدے اور تجربے سے جو عظیم علمی ذخیرہ پچھلی دو تین صدیوں میں فراہم کیا ہے اس کے بارے میں ان کی معلومات زیادہ سے زیادہ کچھ سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ فلسفہ و منطق کے جدید رجحانات کا انہیں براہ راست کوئی علم نہیں۔ جدید عمرانیات اور خصوصاً سیاسیات اور معاشیات کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا بھی بلاواسطہ علم انہیں حاصل نہیں..... گویا کہ یہ پورا حلقہ ذہنی و فکری اعتبار سے خالصتاً آج سے سات آٹھ سو برس قبل کی دنیا میں رہ رہا ہے اور خواہ ان میں کچھ حضرات اپنی تحریر و تقریر میں کچھ سنی سنائی جدید اصطلاحات بھی استعمال کر لیتے ہوں واقعہ یہ ہے کہ جدید دنیا کا نہ انہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا ہے نہ براہ راست مطالعہ۔

نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا جسد ملی اس وقت دو بالکل متضاد حصوں میں منقسم ہے اور اس بحر محیط میں دو رویں بالکل پہلو بہ پہلو لیکن قطعاً علیحدہ علیحدہ بعینہٖ اسی کیفیت کے ساتھ چلی جا رہی ہیں جس کا نقشہ سورہ رحمٰن کی ان آیات میں کھینچا گیا ہے کہ!

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ

چلائے دو دریا کہ باہم ملے ہوئے (بھی) ہیں (اور) ان کے مابین ایک حجاب (بھی) ہے (جس سے) تجاوز نہیں کر سکتے۔

ان دو متضاد فکری و تہذیبی سورتوں کا سب سے بڑا مظہر دو مختلف نظام ہائے تعلیم ہیں جن میں سے ایک علی گڑھ کا معنوی تسلسل ہے اور دوسرا دیوبند کا اور پوری ملت دو نمایاں طور پر

مختلف مکاتب فکر و نقطہ ہائے نظر کے مابین بٹی ہوئی ہے۔ دونوں کا ایک ایک پہلو مفید و روشن ہے اور ایک ایک مضر اور مایوس کن..... ایک جانب جدید علوم و فنون اور سائنس و ٹیکنالوجی ہے لیکن ملحدانہ طرز فکر اور مادہ پرستانہ نقطہ نظر کے ساتھ اور دوسری طرف ایمان و اسلام ہے لیکن جمود و مطلق اور فرسودہ و از کار رفتہ فلسفہ و منطق کے ساتھ۔ ان دونوں مکاتب فکر کو علیحدہ علیحدہ پروان چڑھتے پوری ایک صدی بیت گئی ہے..... اور واقعہ یہ ہے کہ اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تاحال ان کے مابین امتزاج کی کوئی موثر صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس ان کے مابین ایک مسلسل کشمکش جاری ہے جو اکثر و بیشتر تو خاموش آویزش اور سرد جنگ تک ہی محدود رہتی ہے لیکن کبھی کبھی گرجدار تصادم کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے اور غالباً ملت اسلامی کی اس وقت کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ اس "آویزش" میں کسی واقعی و حقیقی "آمیزش" کا رنگ تاحال پیدا نہیں کیا جا سکا۔

☆ ☆ ☆

حضرت مولینا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

اپنی تالیف **وحدتِ اُمت** میں اگر

○ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح اور مولانا سید انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ
کے دو ایمان افروز اور سبق آموز واقعات کے سوا اور کچھ نہ لکھتے
تب بھی یہ کتاب موتیوں میں تلنے کی مستحق ہوتی
وقت کے اہم ترین موضوع پر اس بہترین اور مفید ترین کتاب کو
اب مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے شایانِ شان طور پر شائع کیا ہے۔
بڑے سائز کے ۵۲ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ہدیہ: ۴ روپے ○ علاوہ محصول ڈاک

علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین

چند درمیانی راہیں

یوں تو ایک عظیم ملت میں فکر و نظر کے صد ہا رنگوں (SHADES) کا پایا جانا ایک فطری اور قدرتی امر ہے' چنانچہ ہماری قوم میں بھی سوچنے کے لاتعداد انداز اور غور و فکر کے بے شمار طور طریقے پائے جاتے ہیں۔ تاہم ذرا دقّت نظر سے دیکھا جائے تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ فکر و نظر کے ان لاتعداد رنگوں میں اصل اور پختہ رنگ دو ہی ہیں۔ ایک علی گڑھ کا دوسرا دیوبند کا۔ بقیہ تمام رنگ جو ان کے مابین یا ان کے ارد گرد پائے جاتے ہیں سب ان کے امتزاج ہی سے وجود میں آئے ہیں اور ان میں سے کسی میں علی گڑھ کا رنگ زیادہ نمایاں ہے اور کسی میں دیوبند[1] کا..... گویا کہ ہماری ملت کے بحر محیط کی اصل دو روئیں یہی ہیں جو تقریباً ایک سو سال سے مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ○ کی طرح بالکل ملحق اور متصل لیکن بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ○ کی سی علیحدگی اور لاتعلقی کے ساتھ مسلسل چلی آ رہی ہیں..... ان میں سے ہر ایک کا ایک مستقل ماضی اور متعین فکری اساس ہے' اور چونکہ ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ایک وسیع و عریض اور پختہ و محکم نظام تعلیم بھی موجود ہے' لہٰذا ان دونوں کے اثرات نہایت دور رس ہیں اور ان کی جڑیں ہمارے جسد ملی میں بہت گہری اتری ہوئی ہیں۔ گویا کہ یہ دونوں مکاتب فکر ہماری قومی و ملی زندگی میں " اَصْلُهَا ثَابِتٌ " کی سی محکم اساس اور " وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ○ کا سا ہمہ گیر اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔

---

[1] کیا اللہ کی شان ہے کہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے ان دونوں دینی و مذہبی اور تہذیبی و ثقافتی سوتوں کے اصل منبعے ہندوستان ہی میں رہ گئے..... اور یہی نہیں بلکہ جیسا کہ بعد میں واضح ہو گا' ان دونوں کے مابین امتزاج کی جتنی کوششیں ہوئیں ان سب کے اصل مراکز بھی وہیں رہ گئے۔

ان میں سے علی گڑھ کی "مذہبی عقلیت" جسے جسٹس امیر علی، سرسید احمد خاں اور مولوی چراغ علی وغیرہم نے مرتب کیا تھا اس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں، ساتھ ہی اس کے مقابلے میں دیوبند جس کی بنیاد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ہاتھوں پڑی اور جن کے ذریعے اس میں کتاب و سنت کا علم ہی نہیں بلکہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی روحانیت بھی سرایت کر گئی تھی، جس طرح قال اللہ اور قال الرسولؐ کا حصار اور دین و مذہب کے "نقل" کے دفاع کا مرکز بنا، اس کی تفصیل بھی ہم بیان کر چکے ہیں..... اور دونوں کے "مذہبی فکر" کے مابین جو بُعد المشرقین پایا جاتا ہے اس کا تذکرہ بھی تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے..... لیکن اس کے بارے میں گمان درست نہ ہو گا کہ یہ بُعد ہمیشہ، ہر حال اور ہر صورت میں موجود رہا۔ اس کے برعکس، واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں سے بعض ایسی شخصیتیں بھی ابھریں جو اپنے اصل مکتب فکر کے مجموعی مزاج کی بالکل ضد ثابت ہوئیں۔ چنانچہ "حسن از بصرہ، بلالؓ از حبش، صہیبؓ از روم" کے مصداق سرزمین علی گڑھ سے بھی بہت سے راسخ العقیدہ، دردمند، ذہناً مسلم اور قلباً مومن لوگ اٹھے جن میں سے ایک مولانا محمد علی جوہر کی مثال ہی اتنی درخشاں و تابناک ہے کہ مزید کی کوئی حاجت نہیں۔ [1] دوسری طرف خاک دیوبند سے مولانا عبید اللہ سندھی ایسی متجددانہ مزاج رکھنے والی شخصیت بھی ابھری جنہوں نے جدید دنیا کا مطالعہ ہی نہیں بھرپور مشاہدہ بھی کیا۔ اور جدید رجحانات کے زیر اثر ملت اسلامیہ کے لئے تمدن و معاشرت اور معیشت و سیاست کے میدانوں میں ایسی راہیں تجویز کیں جن کے لئے استناد دیوبند کے موجود الوقت مقلدانہ ماحول سے نہیں بلکہ صرف امام الہند شاہ ولی اللہ الدہلوی کے فلسفہ ارتفاقات ہی سے مل سکتا تھا!..... تاہم یہ مثالیں محض استثنائی ہیں اور ایک انگریزی [2] مثل کے مطابق، ان سے وہ کلیہ مزید مستحکم ہوتا ہے جو ہم نے بیان کیا تھا۔ یعنی یہ کہ علی گڑھ اور دیوبند کے مابین کم از کم بُعد المشرقین موجود ہے [3]

---

[1] خود علامہ اقبالؒ جن کا تذکرہ بعد میں تفصیل سے آئے گا بہرحال اسی شاخ سے متعلق ہیں۔

[2] EXCEPTIONS PROVE THE RULE !

[3] یہ بُعد صرف مذہبی تصورات اور دینی فکر کے میدان تک ہی محدود نہ رہا بلکہ جیسا کہ ہم تفصیل سے عرض کر چکے ہیں، اس بُعد سے ملی و قومی سیاست بھی بری طرح متاثر ہوئی اور اس میدان میں بھی ان دونوں کے رخ بالکل متضاد سمتوں میں مڑ گئے۔

اس بُعد کا احساس بھی بالکل شروع ہی سے ہو گیا تھا اور اس فاصلے کو کم کرنے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی ضرورت بھی بالکل ابتداء ہی سے محسوس کی جانے لگی تھی..... چنانچہ ان کے مابین امتزاج اور ارتباط کی کوششوں کا سراغ بھی بالکل ابتداء ہی سے ملتا ہے۔ ندوۃ العلماء کا قیام ان کوششوں کا مظہر اول تھا..... اور دہلی میں جمعیت الانصار اور جامعہ ملیہ کا قیام مظہر ثانی پھر ان ہی کوششوں کا ایک تیسرا مرکز جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن بنا اور اس نے بھی جدید و قدیم کو قریب لانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔

ندوہ کے بارے میں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ وہ علی گڑھ کی کوکھ سے بر آمد ہوا۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم جو پہلے علی گڑھ کے پروفیسر شبلی تھے اور بعد میں ندوہ کے علامہ شبلی بنے 'ابتداءً سرسید مرحوم کے رفقاء اور اعوان و انصار میں سے تھے۔ جو بعد میں ان سے بد ظن اور ان کی تعلیمی سکیم سے غیر مطمئن ہو کر ان سے علیحدہ ہوئے۔ ہمیں یہاں ان اسباب سے کوئی بحث نہیں جن کی بنا پر یہ علیحدگی واقع ہوئی۔ ہمیں بحث قیام ندوہ کے صرف اس پہلو سے ہے کہ یہ قدیم و جدید..... اور تجدد و جمود کے مابین ایک متوازن علمی و فکری راہ پیدا کرنے کی سعی کا سب سے پہلا اور ہر اعتبار سے اہم ترین مظہر ہے۔

لیکن..... یہ ایک واقعہ ہے کہ ندوہ فکر و نظر کا مرکز بننے کی بجائے صرف عربی زبان و ادب کا ایک گہوارہ اور تاریخ اسلامی کا ایک دار الاشاعت بن کر رہ گیا۔ اور علی گڑھ کے جدید اور دیوبند کے قدیم مذہبی فکر کے مابین کوئی حقیقی اور واقعی امتزاج پیدا کرنے میں بالکل ناکام رہا.....!

ایک جدید لیکن متوازن "علم کلام" کی تدوین کی ضرورت کا احساس تو مولانا شبلی کو شدت کے ساتھ تھا۔ چنانچہ اسی لئے پہلے انہوں نے "علم الکلام" میں قدیم علم کلام کی تاریخ مرتب کی اور پھر نیا علم کلام "الکلام" کے نام سے لکھنا شروع کیا..... لیکن ایک تو وہ اس کی صرف ایک جلد لکھ کر رہ گئے حالانکہ اس کی تکمیل ان کے پیش نظر سکیم کے مطابق تین جلدوں میں ہونی تھی[1] اور دوسرے یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے

---

[1] غالباً اس لئے کہ اس پہلی ہی جلد پر جو مخالفت ہوئی اور کفر کے فتوے موصول ہوئے۔ وہی مولانا شبلی کے لئے بہت کافی تھے۔

کہ وہ وقت کے تقاضے کو بھی بالکل نہ سمجھ پائے۔ اور جو "علم کلام" اس وقت حقیقتاً مطلوب تھا اس کے فروغ کے اصول بھی ان پر واضح نہ ہو سکے!

جن دو انتہاؤں کے مابین مولانا شبلی ایک متوازن راہ نکالنا چاہتے تھے ان کا تذکرہ خود ان کے الفاظ میں سنئے۔

"حال ہی میں علم کلام کے متعلق مصر، شام اور ہندوستان میں متعدد کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اور نئے علم کلام کا ایک دفتر تیار ہو گیا ہے۔ لیکن یہ نیا علم کلام دو قسم کا ہے یا تو وہی فرسودہ اور دور از کار مسائل و دلائل ہیں جو متاثرین اشاعرہ نے ایجاد کئے تھے [1] یا یہ کیا ہے کہ یورپ کے ہر قسم کے معتقدات اور خیالات کو حق کا معیار قرار دیا ہے اور پھر قرآن و حدیث کو زبردستی کھینچ تان کر ان سے ملا دیا ہے [2] ..... پہلا کورانہ تقلید ہے اور دوسرا تقلیدی اجتہاد [3] ....." (علم الکلام۔ تمہید)

ان دونوں کو رد کر کے جس تیسرے علم کلام کی ضرورت ہے اس کے ضمن میں "جدید تعلیم یافتہ گروہ" کا نقطہ نظر مولانا نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

"ہر طرف سے صدائیں آ رہی ہیں کہ پھر ایک نئے علم کلام کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو سب نے تسلیم کر لیا ہے لیکن اصول کی نسبت اختلاف ہے۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتا ہے کہ نیا علم کلام بالکل نئے اصول پر قائم کرنا ہو گا۔ کیونکہ پہلے زمانے میں جس قسم کے اعتراضات اسلام پر کئے جاتے تھے، آج ان کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے زمانے میں یونان کے فلسفے کا مقابلہ تھا جو محسن قیاسات اور مظنونات پر قائم تھا۔ آج بدیہیات اور تجربہ کا سامنا ہے اس لئے اس کے مقابلے میں محض قیاسات عقلی اور احتمال آفرینیوں سے کام نہیں چل سکتا" (ایضاً)

لیکن کمال سادگی کے ساتھ اس رائے کو محض یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ۔

"لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں۔ قدیم علم کلام کا جو حصہ آج بیکار ہے پہلے بھی ناکافی تھا۔ اور جو حصہ اس وقت کار آمد تھا آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کیونکہ کسی شے کی صحت

---

[1] یہ صاف اشارہ ہے حلقہ دیوبند کی نئی کلامی تصنیفات کی جانب جیسے مثلاً مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی "حجۃ الاسلام"!

[2] مراد ہے سرسید احمد خان اور مولوی چراغ علی کا علمِ کلام

[3] مولانا کا یہ طرز تعبیر یقیناً بہت قابل داد ہے۔

اور واقعیت زمانہ کی امتداد و انقلاب سے نہیں بدلتی۔ اس بنا پر مدت سے میرا ارادہ ہے کہ علم کلام کو قدیم اصول اور موجودہ مذاق کے موافق مرتب کیا جائے..... " (ایضاً)

چنانچہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ یہی تھا کہ قدیم علم کلام کو نئے اسلوب' نئے پیرایہ بیان اور نئے انداز میں گویا کہ نئے "مذاق" کے مطابق پیش کر دیا۔

لیکن اصل مسئلے کے فہم کی کوتاہی میں مولانا شبلی غالباً بالکل معذور ہیں۔ اس لئے کہ ایک تو ان کے زمانے تک جدید فلسفے اور سائنس کا ادغام نہیں ہوا تھا۔ دوسرے خود فلسفہ بھی ابھی صرف سپنسر اور مل[1] تک ہی پہنچا تھا۔ گویا کہ فکر جدید کا اصل چیلنج ابھی پوری طرح سامنے نہیں آیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "الکلام" کے مقدمے میں مولانا نے فلسفہ و سائنس کی موجودالوقت صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"تمام دنیا میں ایک غل مچ گیا ہے کہ علوم جدیدہ اور فلسفہ جدیدہ نے مذہب کی بنیاد متزلزل کر دی ہے۔ فلسفہ و مذہب کے معرکے میں ہمیشہ اس قسم کی صدائیں بلند ہوتی رہی ہیں اور اس لحاظ سے یہ کوئی نیا واقعہ نہیں۔ لیکن آج یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ فلسفہ قدیمہ قیاسات اور ظنیات پر مبنی تھا اس لئے وہ مذہب کا استیصال نہ کر سکا۔ برخلاف اس کے فلسفہ جدیدہ تمام تر تجربہ اور مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اس لئے مذہب کسی طرح اس کے مقابلے میں جانبر نہیں ہو سکتا..... یہ ایک عام صدا ہے جو یورپ سے اٹھ کر تمام دنیا میں گونج اٹھی ہے لیکن ہم کو غور سے دیکھنا چاہئے کہ اس واقعیت میں مغالطہ کا کس قدر حصہ شامل ہو گیا ہے۔

یونان میں فلسفہ ایک مجموعہ کا نام تھا جس میں طبعیات' عنصریات' فلکیات' الٰہیات' مابعد الطبعیات سب شامل تھا۔ لیکن یورپ نے نہایت صحیح اصول پر اس کے دو حصے کر دیئے جو مسائل مشاہدہ تجربہ کی بناء پر قطعی اور یقینی ثابت ہو گئے ان کو سائنس کا لقب دیا اور جو مسائل تجربہ و مشاہدہ کی دسترس سے باہر تھے ان کا نام فلسفہ رکھا!"

لیکن افسوس کہ یورپ میں یہ "نہایت صحیح اصول" بس تھوڑی دیر ہی چل سکا اور جلد ہی اس کے بجائے وہ "فطری اصول" پھر بروئے کار آ گیا کہ علم ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے' اور اسے سائنس اور فلسفے کے دو جداگانہ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یورپ کا بعد

---

[1] بقول اکبر الہ آبادی مرحوم۔

غزالی و رومی کی بھلا کون سنے گا!
محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مل ہے!

کا فلسفہ ان نظریات کی اساسات پر مرتب و مدوّن ہوا جو سائنس کے بعض شعبوں سے ابھرے جیسے مثلاً ڈارون کا نظریہ ارتقاء اور فرائڈ کا نظریہ جنس وغیرہ۔

الغرض جدید دنیا کو جو نیا علم کلام فی الواقع مطلوب تھا۔ اس کے تو اصول و اساسات کے بارے میں بھی مولانا شبلی صحیح تصور قائم نہ کر پائے تو اس کی تدوین کیا کرتے۔ رہا دوسرے معاملات میں علی گڑھ اور دیوبند کے مابین امتزاج تو اس کی بھی کوئی صورت ندوہ میں پیدا نہ ہو سکی..... اور مولانا شبلی کے بعد ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے جب حلقہ دیوبند کی ایک علمی و روحانی شخصیت یعنی مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو یہ بات بالکل ہی کھل گئی کہ ندوہ کوئی مستقل چیز ہے ہی نہیں۔ اس کی حیثیت بس ایک چھوٹی سی لہر کی ہے جو علی گڑھ کی عظیم رو سے نکل کر بالآخر دیوبند کی دوسری بڑی رو میں جا شامل ہوئی۔ بعد میں جب سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید سید ابوالحسن علی ندوی نے کچھ عرصہ ادھر ادھر کی خاک چھاننے کے بعد بالآخر اسی حلقہ دیوبند کی ایک دوسری روحانی شخصیت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تو یہ اسی سنت سلیمانی کا 'اتباع' ہے۔ بہرحال اب ندوہ کی حیثیت دیوبند کے ایک ضمیمے کی ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک توسیع (EXTENSION) کی اس کا مستقل جداگانہ وجود کوئی نہیں!

اس طرح ندوہ تو بہت جلد ختم ہو گیا اور مولانا شبلی جو درمیانی راہ نکالنا چاہتے تھے وہ اس کے ذریعے سے نہ نکل سکی۔ تاہم ان کی یہ خواہش بعض دوسری پگڈنڈیوں کی صورت میں ظاہر ہوئی جن کا تذکرہ اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا شبلی اپنی ذات میں ایک نہایت جامع الصفات انسان تھے اور ان کی شخصیت ندوہ کی نسبت بہت زیادہ جامع اور گھمبیر تھی چنانچہ وہ بیک وقت علم و فضل، فلسفہ و کلام، شعر و ادب اور ملی و قومی سیاست حتیٰ کہ رندی و رنگینی سب کے جامع تھے۔ ان کے اصل جانشیں سید سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت میں مولانا شبلی کی شخصیت کے صرف چند ہی پہلوؤں کا تسلسل قائم رہ سکا لیکن ان کے زیر اثر دو اور ہستیاں ایسی پروان چڑھیں جو ان کی بعض دوسری صفات کی وارث بنیں اور جن میں مولانا شبلی کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلو اجاگر ہوئے۔ ہماری مراد مولانا حمیدالدین فراہی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ہے۔ یہ دونوں حضرات براہ راست

ندوی تو نہیں ہیں لیکن ان کی تربیت میں مولانا شبلی کا بڑا حصہ ہے..... اور چونکہ برصغیر کی حالیہ مذہبی فکر کے میدان میں علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین دو اہم علمی و فکری سوتے ان ہستیوں کی بدولت پھوٹے ہیں لہٰذا ان کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔

مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم میں متعدد امور بطور قدر مشترک بھی ہیں مثلاً ایک یہی کہ دونوں کی تربیت میں مولانا شبلی کا حصہ تھا۔ دوسرے یہ کہ دونوں کو قرآن حکیم سے خاص شغف تھا۔ تیسرے یہ کہ دونوں اپنے وقت کے انتہائی وضع دار انسان تھے چوتھے یہ کہ دونوں (مولانا شبلی کے بالکل برعکس..... جنہوں نے اپنی 'حنفیت' کی شدت کے اظہار کے لئے 'نعمانی' کی نسبت کو اپنے نام کا مستقل جزو بنالیا تھا) تقلید سے یکساں بعید و بیزار تھے اور دونوں کو اصل ذہنی و علمی مناسبت امام ابن تیمیہؒ سے تھی..... لیکن ان اشتراکات کے بعد اختلافات کا ایک وسیع میدان ہے جس میں یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد تھیں مولانا آزاد میں شبلی کی رندی و رنگینی کا تسلسل بھی موجود رہا جبکہ مولانا فراہی بالکل زاہد خشک تھے' مولانا آزاد کی وضعداری میں شکوہ و تمکنت کی آمیزش تھی جبکہ مولانا فراہی پر فقر و درویشی کا رنگ غالب تھا' مولانا آزاد' ابوالکلام تھے اور ان کی شعلہ بیان خطابت میں ایک لاوا اگلنے والے زندہ آتش فشاں کا رنگ تھا جبکہ مولانا فراہیؒ نہایت کم گو تھے اور ان کا سکوت ایک ایسے خاموش آتش فشاں سے مشابہت رکھتا تھا جس کے باطن میں تو خیالات و احساسات کا لاوا جوش مارتا ہوا ہو لیکن ظاہر میں وہ بالکل ساکت و صامت ہو۔ مولانا آزاد کی تحریر میں اصل زور ادبیت اور عبارت آرائی پر تھا جبکہ مولانا فراہی کی تحریر نہایت سادہ لیکن مدلل ہوتی تھی مولانا آزاد سیاست کے میدان کے بھی شہسوار تھے اور دین کی وادی میں بھی ان کا اصل مقام داعی کا تھا جبکہ مولانا فراہی سیاست سے تمام عمر کنارہ کش رہے اور دین و مذہب کے میدان میں بھی ان کا اصل مقام آخر دم تک صرف ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر کا رہا..... چنانچہ مولانا آزاد طوطی ہند تو تھے ہی ایک وقت ایسا بھی گزرا جب وہ 'امام الہند' قرار پائے جبکہ مولانا فراہی سے ان کی زندگی ہی میں نہیں بلکہ آج تک بھی صرف کچھ علم دوست لوگ ہی واقف ہو سکے..... لیکن اس کے برعکس مولانا آزاد تو آندھی کی مانند اٹھے اور بگولے کی طرح رخصت ہو گئے تا آنکہ آج وہ لوگ بھی ان کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قندیل خود ان ہی کی شمع سے روشن کی۔ جبکہ مولانا فراہی ایک

مستقل طرز فکر اور مکتب علمی کی بنیاد رکھ گئے جن کا نام لیوا ایک ادارہ " دائرہ حمیدیہ " کے نام سے ہندوستان میں اور ایک انجمن مولانا امین احسن اصلاحی کی ذات میں پاکستان میں موجود ہے۔

قران مجید سے جو شغف ان دونوں بزرگوں کو تھا' مزاج کے افتاد کے فرق کی بناء پر اس کا ظہور بھی مختلف صورتوں میں ہوا۔ مولانا آزاد کی تفسیر سورہ فاتحہ اردو ادب کا تو شاہکار (CLASSIC) ہے ہی قران کے جلال و جمال کا بھی ایک حسین مرقع ہے۔ پھر سورہ کہف کے بعض مباحث میں ان کی تحقیق و تدقیق کا تو کوئی جواب ہی نہیں' بایں ہمہ قرانِ حکیم کا کوئی مرتّب و منضبط فکر وہ پیش نہیں کر سکے۔ جبکہ مولانا فراہیؒ نے قرآنِ حکیم کے استدلالی پہلو کو واضح کیا۔ اور ایک طرف نظمِ قرآن کی اہمیت واضح کر کے تدبر قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن پر غور و فکر کے اصول و قواعد از سر نو مرتب و مدون کئے اور دوسری طرف اپنی بعض تصنیفات میں (جو تا حال مسوّدات ہی کی صورت میں ہیں) خالصتہً قرآن حکیم کی روشنی میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد رکھ دی..... جیسا کہ ہم نے عرض کیا' آسمانِ شبلی کے ان " دو ٹوٹے ہوئے تاروں " سے برصغیر کی موجودہ اسلامی فکر کے دو سوتے پھوٹتے ہیں جن کا تذکرہ صورتِ حال کے صحیح اور مکمل جائزے کے لئے ناگزیر ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

مولانا فراہیؒ ..... کے علمی ورثے کے حامل مولانا امین احسن اصلاحی ہیں۔ جنہوں نے اپنی عملی زندگی کی ابتداء ان کے مشن کی تکمیل کے ارادے اور اس کے لئے عملی جدوجہد کے آغاز ہی سے کی تھی۔ چنانچہ تحصیلِ علم سے فراغت کے فوراً بعد انہوں نے ایک طرف مولانا فراہیؒ کی یادگار' مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ کو سنبھالا دوسری طرف دائرہ حمیدیہ قائم کیا تیسری طرف ۳۸ء میں ماہنامہ الاصلاح' جاری کیا جس کے ذریعے فکر فراہیؒ کی اشاعت شروع ہوئی۔ وقس علی ہذا..... لیکن ابھی یہ تمام کام بالکل ابتدائی حالت میں تھے کہ حکیم فراہی کا یہ جانشین ابوالکلام کے معنوی خلیفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی " دعوت اسلامی " کی گھن گرج سے متاثر ہو کر رخت سفر باندھ ان کی خدمت

میں جا حاضر ہوا۔ اور ایک آدھا نہیں سترہ سال ان کی شخصیت کے پیچ و خم میں الجھا رہا[1]..... تا آنکہ پورے سترہ سال اس دشت کی بادیہ پیمائی کے بعد' آج سے دس سال قبل[2] جب آنکھ کھلی اور ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ ماضی بہت پیچھے رہ گیا دائرہ حمیدیہ اور فکرِ فراہیؒ کے تمام قدر دان ہندوستان میں رہ گئے۔ یہاں یکہ و تنہا' نہ کوئی رفیق نہ ہمراہ' نہ اسباب نہ وسائل' الغرض ع

"جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا"

ان حالات میں مولانا امین احسن اصلاحی نے جس طرح پھر "جگر لخت لخت" کو جمع کیا اور از سرِ نو اپنے کام کی ابتدا کی واقعہ یہ ہے کہ یہ اس بڑھاپے کے عالم میں ان کی جواں ہمتی کی دلیل ہے..... بہرحال الاصلاح' کی جگہ میثاق کا اجراء ہوا جو قلت اعوان و انصار کی بناء پر کچھ ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کی مانند چلا اور پھر بند ہو گیا..... "حلقہ تدبر قرآن" قائم ہوا جس کے ذریعے چند نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ نہایت کامیابی سے چلنے کے بعد ان نوجوانوں کے ادھر ادھر منتشر ہو جانے کی بناء پر اس کا کام بھی بند ہو گیا[3]..... تا آنکہ آج سے ڈھائی سال قبل راقم الحروف' جس نے خود مولانا مودودی کی "تحریک اسلامی" ہی کی گود میں آنکھ کھولی تھی اور ان ہی کے واسطے سے مولانا اصلاحی سے متعارف ہوا تھا' لاہور منتقل ہوا اور اسے اللہ نے مولانا کے ان کاموں میں تعاون کی توفیق و

---

[1] اگر مولانا فراہیؒ زندہ ہوتے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ سرمد کے ان الفاظ میں مولانا اصلاحی سے ضرور شکوہ کرتے۔

سرمد دردیں عجب شکستے کر دی
ایمان فدائے چشم مستے کر دی
عمرے کہ بآیات و احادیث گزشت
رفتی و نثار خود پرستے کر دی

(سرمد کی رباعی میں "خود پرستے" کی جگہ "بت پرستے" ہے جسے ہم نے موقع و محل کے لحاظ سے بدل کر مناسبِ حال کر دیا!)

[2] اس تحریر کو پڑھتے ہوئے یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ ۶۸ء میں لکھی گئی تھی!

[3] خدا کا شکر ہے کہ ایک عرصے کے بعد اب پھر یہ حلقہ سرگرم کار ہو گیا ہے۔

سعادت بخشی، تو اس کے فضل و کرم سے "میثاق" بھی از سرِ نو جاری ہوا۔ اور بحمد اللہ تا حال جاری ہے "تدبر قرآن" کی جلد اول بھی شائع ہوئی اور مولانا کے درس قرآن و حدیث کی ایک ہفتہ وار نشست کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو بفضلہٖ تعالیٰ باقاعدگی سے جاری ہے۔

راقم الحروف کو مولانا اصلاحی سے براہ راست تلمّذ کا شرف تو حاصل نہیں تاہم یہ واقعہ ہے کہ قرآن حکیم سے کسی قدر ذہنی مناسبت اسے حاصل ہوئی ہے وہ مولانا ہی کی تحریروں کے مطالعے سے ہوئی ہے اور راقم کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو بھی عمرِ دراز اور صحت و فراغت عطا فرمائے تاکہ وہ اپنے استاد مولانا فراہی کے علمی ورثے کو مزید اضافوں کے ساتھ اگلی نسلی کو منتقل کر سکیں ان کے شاگردوں کو بھی توفیق دے کہ وہ اس کام کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کرنے کا عزم کر سکیں اور راقم کو بھی اس نیک کام میں تعاون کی سعادت نصیب کئے رکھے! آمین۔

بہر حال فکرِ فراہیؒ اور سلسلہ تدبر قرآن علی گڑھ اور دیوبند کے درمیانی علمی و فکری سوتوں میں سے ایک ہے جو اپنی کمیت اور حلقہ اثر سے تو فی الحال زیادہ اہم نہیں لیکن اپنے امکانات کے اعتبار سے یقیناً نہایت اہم ہے خصوصاً اس لئے کہ اس کی بنیاد بھی خالصتاً قرآن حکیم پر ہے اور اُس میں سارا استدلال بھی قرآن ہی سے کیا جاتا ہے اور تدبر قرآن کا جو خاص اسلوب و نہج اس کے ذریعے عام ہو رہا ہے اس سے انشاء اللہ حکمت قرآنی کے بہت سے نئے گوشے سامنے آئیں گے اور فکر انسانی کو نئی رہنمائی ملے گی..... مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تصانیف، حقیقت شرک، حقیقت توحید، اور حقیقت تقویٰ میں ایمان باللہ کے مختلف پہلوؤں سے جس انداز میں بحث کی ہے وہ اگرچہ باصطلاح معروف تو ھعلم کلام، نہیں لیکن خالص قرآنی علم کلام ضرور ہے اور اگر مولانا اپنی سکیم کے مطابق معاد اور رسالت پر بھی اسی انداز سے لکھ سکے تو اس طرح خالصتہ قرآن حکیم کی بنیاد پر ایک نئے علم کلام، کی ترتیب و تدوین کی راہ کھل جائے گی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اگرچہ کبھی صراحۃً کیا کنایۃً بھی یہ تسلیم نہیں کیا۔ ——— اور اُن کے مخصوص مزاج اور اُفتادِ طبع کے پیشِ نظر اُن سے

اس کی توقع بھی عبث ہے..... کہ انہوں نے اپنی تحریک کے "اصول و مبادی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے اخذ کئے ہیں[1] تاہم واقعہ یہی ہے کہ ۳۸۔۱۹۳۷ء کے لگ بھگ جب مسلمانانِ ہند کی قومی و ملّی سیاست کا ایک رخ متعین ہو گیا اور اس کی قیادت و سیادت میں انہیں کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا تو انہوں نے کسی دوسری راہ پر سوچنا شروع کیا اور اس کے لئے انہیں سارا پکا پکایا اور بالکل تیار مواد مولانا ابوالکلام آزاد سے مل گیا۔ چنانچہ انہوں نے مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کی جگہ خود سنبھالی، ان کی وضع کردہ اصطلاح حکومت الٰہیہ کو اپنا نصب العین بنایا (جس کی مزید تشریح خیری برادران کر چکے تھے) ان کی حزب اللہ کے نقشے پر اپنی جماعت اسلامی قائم کر دی اور اپنی تحریک اسلامی، کو انہی خطوط پر شروع کر دیا جو مولانا آزاد نے متعین کئے تھے لیکن جن پر وہ اپنی بعض کمزوریوں یا کچھ موانع کے باعث آگے نہ چل سکے تھے، یہی وجہ ہے کہ مولانا مودودی اگرچہ ایک بہت بڑے

---

[1] اس معاملے میں مودودی صاحب جتنے پختہ واقع ہوئے ہیں اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے (۱) نہ تو کبھی نیاز فتح پوری سے حاصل کردہ انشاء پردازی کی بنیادی تربیت کا ذکر فرمایا، (۲) نہ ابوالکلام مرحوم اور خیری برادران سے اخذ کردہ تصورِ حکومتِ الٰہیہ پر ان حضرات کا کبھی ذکر خیر کیا (۳) اور نہ ہی علامہ اقبالؒ کا یہ احسان کبھی علانیہ تسلیم کیا کہ انہوں نے انہیں حیدر آباد دکن ایسی سنگلاخ جگہ سے جہاں بقول خود ان کے کوئی ان سے یہ بھی نہ پوچھتا تھا کہ "تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں"! پنجاب کی اس سرزمین میں پہنچایا جو ہر تحریک اور نئی دعوت حتیٰ کہ دعویٰ نبوت تک کے لئے نہایت زرخیز و ساز گار ہے۔
..... حتیٰ کہ جب علامہ اقبال کا انتقال ہوا اور ملک بھر میں صفِ ماتم بچھ گئی تب بھی مدیر، ترجمان القرآن نے کوئی کلمۂ خیر..... یا کلمۂ تعزیت اپنے موقر جریدے میں شائع نہ فرمایا۔
اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی راوی ہیں کہ جب خود انہوں نے اس معاملے میں مودودی صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا "میں اس وقت حالتِ جہاد میں ہوں اور میدانِ قتال میں مردے دفن کرنے کی فرصت کب ہوتی ہے"۔ چشتی صاحب فرماتے ہیں کہ بعد میں جب میں نے یہ دیکھا کہ مودودی صاحب کے حلقے کے جرائد نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اور چودھری علی احمد مرحوم کی وفات پر خاص نمبر تک نکالے اور کتابیں شائع کیں تو میں حیران رہ گیا ؎

"کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!"

مصنّف اور مؤلف ہیں اور بسیار نویسی میں ان کے مدمقابل صرف دو غلام احمد ہی ہیں[1]۔ تاہم دین و مذہب کے میدان میں ان کا اصل مقام ابوالکلام مرحوم ہی کی طرح داعی کا ہے نہ کہ مفکر کا..... بایں ہمہ چونکہ ان کا وسیع و عریض لٹریچر برصغیر کے طول و عرض میں بھی پھیلا ہے اور مشرق وسطیٰ میں بھی لہٰذا ملت اسلامیہ کی جدید مذہبی فکر کے اس جائزے میں ان کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے۔ !

مودودی صاحب خود بھی اس امر کے مدعی ہیں اور ان کے بارے میں عام طور پر یہ خیال بھی پایا جاتا ہے کہ وہ "بیچ کی راس" کے آدمی ہیں یعنی انہوں نے علی گڑھ کی پیدا کردہ متجددانہ ذہنیت اور دیوبند کے قدامت پرستانہ مزاج کے مابین ایک درمیانی راہ پیدا کی ہے اور گویا قدیم و جدید کو بہم کر دیا ہے ان کا دعویٰ اس اعتبار سے وزنی ہے کہ ان کی دینی دعوت اور ان کا مذہبی فکر دونوں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ طبقے میں پھیلے ہیں اور نہ صرف ملّتِ اسلامیہ ہندو پاک بلکہ مشرقی وسطی کے بعض ممالک کی نوجوان نسل کا بھی ایک خاصہ قابل ذکر حصہ ان کے زیر اثر ہے..... ان کے خود بیچ کی راس کے آدمی ہونے کا یہی ثمرہ تھا کہ ابتداء برصغیر کے تمام درمیانی مکاتب فکر کے علمبرداران کی جانب کھنچ آئے[2] چنانچہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا' ایک جانب مولانا فراہیؒ کے جانشین مولانا اصلاحی اپنے تمام کام چھوڑ چھاڑ کر ان کے پاس آ گئے۔ دوسری طرف مولانا سید سلیمان ندویؒ کے دونوں اہم شاگرد یعنی مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی ان کے گرد جمع ہو گئے..... پھر یہ بھی ان کے علی گڑھ اور دیوبند کے مابین کی شخصیت ہونے کا نتیجہ تھا کہ ایک جانب حلقہ دیوبند سے ایک بے تاب روح' مولانا محمد منظور نعمانی کی صورت میں ان کی طرف کھنچ آئی اور دوسری

---

[1] یعنی ایک آنجہانی غلام احمد قادیانی اور دوسرے ایں جہانی غلام احمد پرویز!

[2] یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ سکہ بند مذہبی حلقوں میں سے مولانا مودودی کی طرف صرف اس طبقہ اہل حدیث کے لوگ آئے جو ایک تو غیر مقلد ہونے کے باعث ویسے ہی 'آزاد' ہوتے ہیں' دوسرے یہ واقعہ ہے کہ اس طبقے میں خدمت و نصرتِ دین کا داعیہ ہمیشہ سے اتنا شدید رہا ہے کہ یہ ہر نئی دعوت پر اس امید میں والہانہ لپکتے ہیں کہ شاید اسی کے ذریعے اسلام کی غربت' ختم ہو جائے اور وہ خدا کے یہاں اسلام کے اس دور غربت میں اس کے ہمدرد و مونس و غم خوار شمار ہو جائیں!

طرف سلسلہ سرسید سے بھی مولانا عبدالجبار غازی (پرنسپل اینگلو عربک ہائی سکول دہلی) ایسے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے..... یہ دوسری بات ہے کہ مولانا مودودی اس شیرازے کو مجتمع نہ رکھ سکے اور کوئی جلد اور کوئی بدیر بدظن یا غیر مطمئن ہو کر ان سے کٹ گیا..... تاہم چونکہ ان میں تنظیمی صلاحیت اور محنت اور مستقل مزاجی کے ساتھ کام کرنے کا مادّہ ابتدا ہی سے موجود تھا' وہ اس ساری آمدورفت' کے علی الرغم ایک مذہبی فرقے کی حد تک لوگ کالجوں اور یونیورسٹیوں اور مدرسوں اور دارالعلوموں دونوں سے ہی فارغ التحصیل شامل ہیں۔

مولانا مودودی کی تحریک اسلامی کہاں اور کس مؤقف سے شروع ہوئی اور پھر وہ کن کن مراحل سے گزر کر بالآخر کہاں پہنچی اور اب "عشق بلاخیز" کا یہ "قافلہ سخت جان" کس وادی اور کس منزل میں ہے یہ ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے جس پر ہم نے اپنی کتاب "تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ" میں مفصل بحث کی ہے یہاں اصل گفتگو ان کی تحریک سے نہیں بلکہ ان کے 'فکر' سے ہے..... اگرچہ یہاں اس اعتراف کا اعادہ کئے بغیر گزرا نہیں جارہا کہ راقم الحروف نے خود بھی شعور کی آنکھ اسی تحریک کی گود میں کھولی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ اسی کے طفیل پایا۔

فکر..... کے میدان میں مولانا مودودی نے ابتداء ہی سے یہ حکمت عملی برتی کہ فلسفہ اور علم کلام کے مشکل موضوعات سے کامل اجتناب کیا۔ حتیٰ کہ عقائد کے باب میں بھی ہمیشہ نہایت اجمال واختصار کے ساتھ بات کی۔ اور جتنی کی اس میں بھی زیادہ تر ان اعتقادات کو بیان (NARRATE) کرنے پر اکتفا کیا جو امت کے سواد اعظم کے یہاں معروف ومقبول ہیں۔ چنانچہ انہوں نے نہ تو الٰہیّات ومابعد الطبعیات سے بحث کی' نہ جدید فلسفیانہ رجحانات سے تعرض کیا حتیٰ کہ ان گمراہ کن نظریات سے بھی براہ راست بحث و گفتگو سے احتراز کیا جو جدید سائنس کے مختلف شعبوں سے ابھرے ہیں[1]..... گویا کہ علم کلام کی اصل سنگلاخ وادی میں انہوں سرے سے قدم ہی نہیں رکھا

---

[1] ان نظریات مثلاً (ڈارون کا نظریہ ارتقاء) پر مولانا کی تنقید زیادہ سے زیادہ کچھ پھبتیاں کسنے تک محدود ہے اور وہ بھی صرف رسائل ومسائل" ایسی کتابوں میں۔

اس کے برعکس انہوں نے عمرانیاتِ اسلام' کو اپنا اصل موضوع بنایا۔ اور عمرانیات کے مختلف شعبوں یعنی تمدّن و اخلاق معاشرت و معیشت اور ریاست و سیاست کے باب میں جدید نظریات جن اصطلاحات میں اور جس اسلوب و انداز سے مرتب و مدوّن ہوئے ہیں انہی کو استعمال کر کے انہوں نے 'اسلامی نظامِ زندگی' کا ایک مربوط و منضبط تصوّر پیش کرنے کی کوشش کی، جس میں وہ بلاشبہ بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ اس اعتبار سے انہیں زیادہ سے زیادہ ایک عمرانی مفکر (SOCIAL THINKER) قرار دیا جاسکتا ہے گویا کہ ان کی اوّلین نمایاں ترین اور بنیادی و اساسی حیثیت تو داعی کی ہے (اور اس پہلو سے وہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت کا معنوی تسلسل ہیں) ثانوی حیثیت میں انہیں اسلام کا ایک جدید عمرانی مفکّر بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔

متذکرہ بالا حکمتِ عملی سے مودودی صاحب کو فائدے بھی بہت سے پہنچے مثلاً ایک[1] یہی کہ اعتقادی و کلامی بحثوں سے احتراز کی بناء پر ایک طویل عرصے تک وہ مذہبی طبقات کی مخالفت سے بچے رہے۔ اور اس میدان میں قدم رکھتے ہی تکفیر و تفسیق کے جن فتووں کا سامنا ناگزیر ہوتا ہے ان سے محفوظ رہے..... دوسرے یہ کہ ان کا یہ اوسط درجے کا فکر قوم کے درمیانی و متوسّط طبقے میں تیزی کے ساتھ پھیلا اور سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ بہت سے نوجوان "اسلامی نظامِ حیات" کے اس تصوّر کو قبول کر کے اس کے 'قیام' کی عملی جدوجہد کے لئے آمادہ ہوگئے..... گویا ان کی تحریک اسلامی کے لئے راہ ہموار ہو گئی..... لیکن اس کے بہت سے مضر عواقب بھی ظاہر ہوئے۔ مثلاً سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ مذہب کا اعتقادی و تعبدی پہلو بالکل دب کر رہ گیا اور اسلام کی بس یہی ایک حیثیت نگاہوں کے سامنے رہ گئی کہ وہ ایک نظام زندگی ہے۔ پھر چونکہ عمرانیات کے مختلف شعبوں میں سے بھی مودودی صاحب کا اصل میدان "سیاسیات" کا ہے اور اسلام کے نظامِ زندگی میں بھی ان کی اصل نگاہ اس کے نظریہ ریاست و سیاست پر ہے لہٰذا پورے دین و مذہب

---

[1] اس موضوع پر اختصار کے ساتھ راقم نے اپنی تحریر "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" میں بحث کی ہے اور تفصیل کے ساتھ ہندوستان کی جماعت اسلامی کے ایک سابق رکن (بلکہ رکن شوریٰ) وحیدالدین صاحب نے "تعبیر کی غلطی" نامی کتاب میں بحث کی ہے۔

کی انہوں نے ایک خالص سیاسی تعبیر کر ڈالی اور دین کا اصل جوہر یعنی عبد و معبود کا باہمی ربط و تعلق بالکل نظر انداز ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والوں میں سے اکثر و بیشتر کے معاملے میں یہ صورت حال نظر آتی ہے کہ وہ مذہب کے بنیادی لوازم سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ نماز روزے تک کے پابند نہیں رہتے گویا کہ ان کا دین و مذہب کے ساتھ کل لگاؤ تحریک اسلامی ہی کی بنیاد پر قائم تھا جو اس سے انقطاع کے ساتھ ہی منہدم ہو گیا۔ دوسرا اور ہماری اس وقت کی گفتگو کے اعتبار سے اہم تر، نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ان کے زیر اثر نوجوانوں میں سے جنہیں بعد میں باہر کی دنیا سے سابقہ پیش آتا ہے اور وہ اپنے ملک اور اس کے بھی خالص اپنی تحریک کے محدود حلقے سے باہر نکل کر یورپ کی یونیورسٹیوں میں پہنچے ہیں اور وہاں مغرب کے اصل فکر سے براہ راست ان کا سامنا ہوتا ہے تو ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں[1] کہ ان کا سابق اسلامی فکر یت کے کچے گھروندوں کی طرح جواب دے جاتا ہے اور وہ ریب و تشکک کا شکار ہو کر بعض اوقات بے دینی و الحاد تک جا پہنچتے ہیں..... اسی کا ایک شاخسانہ یہ بھی ہے کہ چونکہ یہ مذہبی فکر، کسی پختہ اور محکم فلسفیانہ اساس پر قائم نہیں۔ لہٰذا اس میں نمو اور ترقی کی صلاحیتیں بھی مفقود ہیں۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے حلقے کے جرائد کو دیکھ لیجئے یا نئی مطبوعات کو..... حتیٰ کہ ان کے قائم کردہ ریسرچ کے اداروں تک سے جو چیزیں شائع ہو رہی ہیں ان سب میں بس دو ہی چیزیں نظر آئیں گی۔ یا تو "فرمودات ماؤزے تنگ" کی طرح فرمودات مودودی، کی تشریح و توضیح..... یا پھر خالص جماعتی اور تحریکی پروپیگنڈا..... اس میں اگر کوئی اضافہ پچھلے چند سالوں سے ہوا ہے تو صرف یہ کہ الاخوان المسلمون کے اہل قلم کی نگارشات اور ان کی تحریک اور شرق اوسط کے عام حالات پر معلوماتی مضامین بھی مل جاتے ہیں..... اور بس!

الغرض..... قدیم و جدید کا امتزاج سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کی جماعت کے ذریعے ہوا ہے واقعہ یہ ہے کہ وہ بہت سطحی ہے اور اس نئے پیوند کی اپنی مستقل جڑ کوئی نہیں! لہٰذا نہ صرف یہ کہ اس کے نشوونما اور بڑھنے اور پھلنے پھولنے کا کوئی امکان نہیں بلکہ اس کا بقاء و وجود بھی بہت مشتبہ ہے۔

---

[1] اور یہ صورت عموماً نسبتاً ذہین تر نوجوانوں کے ساتھ پیش آتی ہے۔ اور جماعت اسلامی سے قریب کا تعلق رکھنے والے لوگوں کو بخوبی علم ہے کہ اس طرح کے حادثوں کی مثالیں بہت عام ہیں۔

اس اعتبار سے ہمارے نزدیک برصغیر کی اہم ترین شخصیت علامہ اقبالؒ کی ہے اور علوم و فنون جدیدہ کی روشنی میں "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" کے ضمن میں واقعی اور حقیقی قدر و قیمت رکھنے والا کچھ کام اگر کسی نے کیا ہے تو وہ تنہا ان ہی کی ذات ہے چنانچہ اعلیٰ ریاضی و طبعیات اور اعلیٰ نفسیات کی بنیاد پر انہوں نے مذہب کی بعض اساسات کا اثبات جس طریق پر کیا ہے اور خوگران تجربہ و شہود کے سامنے مذہب کو بھی ایک واقعی اور حقیقی تجربے کی حیثیت سے جس طرح پیش کیا ہے وہ فکرِ جدید کا رشتہ ایمان کے ساتھ جوڑنے کی ایک اہم کوشش ہے جو بالکل ابتدائی اور بنیادی ہونے کے باوجود اور اپنی بعض خامیوں اور غلطیوں کے علی الرغم نہایت وقیع اور قابلِ قدر ہے۔

نوٹ

اس سلسلۂ مضامین کی آخری کڑی..... یعنی "علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین چند درمیانی راہیں" کے عنوان سے جو تحریر ابھی آپ نے مطالعہ فرمائی، وہ میثاق بابت نومبر ۶۸ء میں بطور "تذکرہ و تبصرہ" شائع ہوئی تھی اور اس پر ایک حد درجہ تحسین آمیز خط مولانا عبدالماجد دریابادی کی جانب سے موصول ہوا تھا!

لکھنے اور بولنے والوں کو اپنی تحریر و تقریر پر داد و بیداد دونوں ہی سے سابقہ رہتا ہے اور عام قاعدہ یہی ہے کہ ان کا زیادہ ذکر نہیں کرنا چاہئے" خصوصاً اپنی تعریف و تحسین کو نقل کرنا تو بہت ہی معیوب ہے۔ لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی کا وہ خط میثاق' کی دسمبر ۶۸ء کے کور پر لفظ بلفظ شائع کر دیا گیا تھا..... اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ بلاشبہ مولانا موصوف خود اپنی ذات کے اعتبار سے برصغیر ہندو پاک کے دور حاضر کے علمی' ادبی' فکری اور صحافتی حلقے کی چوٹی کی شخصیتوں میں سے تھے اور یہ بات بجائے خود کچھ کم اہم نہیں لیکن..... ان کے خط کی اشاعت کا اصل سبب یہ تھا کہ زیر تذکرہ تحریر میں مسلمانان ہند کی جس بزم ملی و دینی کے اعاظم رجال کا تذکرہ' اور ان کی علمی و فکری تحریکوں پر تبصرہ کیا گیا تھا مولانا موصوف نہ صرف یہ کہ خود اس بزم کے شرکاء میں سے تھے بلکہ اس تحریر کی اشاعت کے وقت وہی اس قافلۂ ملی کی آخری بقید حیات شخصیت تھے۔ گویا ان رجال کے ضمن میں مولانا کی رائے ایک چشم دید گواہ کی شہادت کا درجہ رکھتی ہے..... (افسوس کہ اب مولانا موصوف

"اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے"

کا مصداق بن چکے' فیغفر اللہ لنا ولہ وادخلہ فی اعلیٰ علیین!)

' میثاق' دسمبر ۶۷ء کے کور کا عکس سامنے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں! (اسرار احمد)

مکتوب گرامی مولانا عبدالماجد دریابادی بنام ڈاکٹر اسرار احمد

"تحسین ناشناس !"

مکتوب مولانا عبدالماجد دریابادی

بنام

مدیر میثاق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

'صدق جدید'
دریا باد ضلع بارہ بنکی

مورخہ : ۱۱ نومبر ۱۹۶۸

صاحب من ، السلام علیکم

میثاق ، بابت نومبر پیش نظر ہے : صفحہ ۱ تا صفحہ ۱۳ ،
تحسین ناشناش کا ڈر نہ ہوتا تو دل نے تو بے اختیار یہ صلاح دی کہ اس ساری عبارت پر ایک خوب بڑا سا صاد

ص

کھینچ کر بھیج دیجئے ۔ سبحان اللہ ، ما شاء اللہ ۔ ع
'دل نے یہ جانا کہ یہ سب کچھ ہی میرے دل میں تھا !'

حیرت ہوگئی ، کہ شبلی ، فراہی ، ابوالکلام ، تینوں کی یہ نباضی ، بعد زمانی و بعد مکانی دونوں کے باوجود ، اتنی صحیح کیونکر کرلی ! ع
' در حیر تم کہ بادہ فروش از کجا شنید ! '

ڈاکٹر رفیع الدین کا بھی مقالہ اس نمبر میں بڑا قابل داد ہے ۔

والسلام
دعاگو و دعاخواہ
عبدالماجد"

- یہود نے عہدِ صدیقی رضؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا، آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانی ابو لؤلؤ فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں
- علی مرتضیٰ رضؓ کی طرح حضرت حسین رضؓ بھی قاتلینِ عثمان رضؓ کی سازش کا شکار ہوئے۔
- سیّد الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟

تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لیے

امیر تنظیمِ اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد**

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں کا مطالعہ کیجیے:

① **سانحہ کربلا**: حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزیمت و عظمت کی صحیح تصویر

② **شہیدِ مظلوم**: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب اور آپ کی مظلومانہ شہادت کے بیان پر جامع تالیف

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت صرف -/۹ روپے (سستا ایڈیشن -/۴)
قریبی بکسٹال سے طلب کیجیے یا ہم سے منگوائیے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون نمبر: ۸۵۲۶۸۳

(Saeed)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

(۶)

حکمتِ اقبال

اقبال کا مقامِ عظیم

تعلیم نبوّت اور فلسفہ کا یہ اتصال انسان کے علمی ارتقا کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے جو نوعِ انسانی کو ترقّی کے ایک نئے دَور میں داخل کرتا ہے اور اقبال اس دَور کا نقیب ہے اس واقعہ سے اس عالمگیر ذہنی انقلاب کا آغاز ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور جس کے نتیجہ کے طور پر مسلمان قوم دنیا میں غالب ہوگی اور عالمِ انسانی امن اور اتحاد کی دولت سے مالا مال ہوگا۔ اس واقعہ سے حقیقتِ انسان کا علم جس پر انسان کے دائمی امن اور اتحاد کا دارومدار ہے۔ پہلی دفعہ ایسی منظم صورت میں سامنے آیا ہے جو دورِ حاضر کے انسان کو مطمئن کر سکتی ہے اور جو اس کی عالمگیر مقبولیّت کی ضامن ہے۔ اقبال مسلمانوں کو نہایت زور دار الفاظ میں "عشق" اور "زیرکی" کی جس آمیزش کی دعوت دیتا ہے وہ خود ہی اس کا آغاز کرتا ہے اور اس طرح سے خود ہی "عالمِ دیگر" کی بنیاد رکھتا ہے۔ گویا اقبال آئندہ کے اس عالمگیر ذہنی انقلاب کا نقیب ہی نہیں بلکہ بانی بھی ہے جس کے بعد اور کوئی ذہنی انقلاب نہیں آسکے گا لہٰذا اقبال آئندہ کی مستقل عالمگیر ریاست (WORLD – STATE) کا وہ ذہنی اور نظریاتی بادشاہ ہے جس کی بادشاہت کو زوال نہیں۔ ایک معمولی آدمی کے لیے جو رسول نہیں بلکہ رسولؐ کا ایک ادنیٰ غلام ہے عظمت کا یہ مقام اس قدر بلند ہے کہ اس سے بلند تر مقام ذہن میں نہیں آسکتا۔ اقبال اپنے اس مقام سے آگاہ ہے یہی سبب ہے کہ وہ بار بار اپنے اشعار میں کہتا ہے کہ اسے زندگی کے راز سے آشنا کیا گیا ہے آج تک کسی شخص نے کائنات کے وہ اسرار و رموز بیان نہیں کیے جو اس نے بیان

کیے ہیں۔اس کی حکمت معانی اور حقائق کے بیش قیمت موتیوں کی ایک لڑی ہے جس کی کوئی نظیر آج تک پیش نہیں کی گئی۔اگرچہ وہ ایک ذرہ ہے لیکن سورج کی روشنی سے ہمکنار ہے۔ علم و حکمت کے نور کی سینکڑوں صبحیں اس کے گریبان میں روشن ہیں اس کی خاک جام جم سے زیادہ منور ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آنے والے دور میں کیا ہونے والا ہے۔اس کے فکر کی رسائی ان حقائق تک ہوئی ہے جو ابھی دوسرے لوگوں پر آشکار نہیں ہوئے۔

چشمۂ حیواں براتم کردہ اند — محرم رازِ حیاتم کردہ رند
ہیچ کس رازے کہ من گویم نگفت — ہمچو فکر من در معنی نہ سفت
ذرہ ام مہرِ منیر آنِ من است — صد سحر اندر گریبان من است
خاک من روشن تر از جام جم است — محرم از نازاد ہائے عالم است
فکرم آں آہو سر فتراک بست — کو ہنوز از نیستی بیرون نجست

سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید
عمر ہا در کعبہ و بت خانہ مے نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

وہ جانتا ہے کہ اگرچہ آج کا انسان اپنی علمی بے مائیگی اور روحانی پس ماندگی کی وجہ سے پوری طرح اس کی قدر دانی نہ کر سکے گا تاہم مستقبل میں پوری نوع بشر اس کے افکار کو اپنائے گی اور اس کی فکری قیادت کو قبول کرے گی وہ تنہا نہیں رہے گا بلکہ سینکڑوں کارواں اس کے ہمراہ ہوں گے، وہ صبح عنقریب نمودار ہونے والی ہے جب لوگ جہالت کی نیند سے اٹھیں گے اور محبت کی اس آگ کے ارد گرد جو اس نے روشن کی ہے۔آگ کے پجاریوں کی طرح ذوق و شوق سے جمع ہوں گے وہ مستقبل کے شاعر کی آواز ہے اور ایسا نغمہ ہے جسے زخمہ ور کی حاجت نہیں اور جو ہر حالت میں بلند ہو کر رہے گا۔اس کا کلام ایک عالمگیر انقلاب اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے جب یہ انقلاب آئے گا تو لوگ اس کے اشعار پڑھ پڑھ کر جھومیں گے اور کہیں گے کہ یہ وہ مرد خود آگاہ ہے جس نے دنیا کو بدل دیا ہے:

عصرِ من دانندۂ اسرار نیست ‏ ‏ یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست
نغمۂ من از جہانِ دیگر است ‏ ‏ ایں جرس را کاروانے دیگر است
نغمہ ام از زخمۂ بے پرواستم، ‏ ‏ من نوائے شاعرِ فرداستم
بچشم کم مبین تنہا بیمیم را ‏ ‏ کہ من صد کارواں گل در کنارم
قُلزمِ یاراں چو شبنم بے خروش ‏ ‏ شبنمِ من مثلِ یم طوفاں فروش
انتظارِ صبح خیزاں مے کشم ‏ ‏ اے خوشا زردشتیانِ آتشم

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اقبال کی خودستائی ٹھوس علمی حقائق ہیں

اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اقبال کے اس قسم کے اشعار محض خودستائی کے جذبات یا شاعرانہ تعلّیات پر مشتمل نہیں بلکہ ایسے ٹھوس حقائق کو بیان کرتے ہیں جو مضبوط علمی اور عقلی بنیادوں پر قائم ہیں جو اس کے فلسفہ کا جزو لاینفک ہیں اور جن کا اظہار اس کے لیے خود اپنے فلسفہ کی تشریح کے لیے ضروری تھا اگر اقبال ان کا اظہار نہ کرتا تو اس کا فلسفہ ناتمام رہ جاتا اور یہ ایک ایسی فروگذاشت ہوتی جس کی وجہ سے اقبال کی قوم ایک حد تک اس کے فکر کی معقولیّت اور اہمیت سے ناآشنا رہ جاتی۔

اقبال کا امتیاز

اس کے جواب میں شاید یہ کہا جائے گا کہ اگر آج تک کوئی غیر مسلم فلسفی ایسا نہیں ہوا جو نبوت کاملہ کے تصوّرِ حقیقت پر اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھتا ہو تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے لیکن اگر اقبال سے پہلے کوئی ایک بھی مسلمان فلسفی گزرا ہے تو اس کے فلسفے کی بنیاد لازماً خدا کے اسلامی تصوّر پر ہو گی تو پھر اقبال کی خصوصیت کیا ہے پھر کیوں نہ اس مسلمان فلسفی کو نوعِ بشر کا آخری

فلسفی اور آئندہ کے عالمگیر ذہنی انقلاب کا بانی قرار دیا جائے اور پھر اس سلسلہ میں شاید شاہ ولی اللہ اور محیّ الدین عربی ایسے اکابرِ اسلام کا نام لیا جائے۔ لیکن اس زمانے کے خاص ذہنی حالات اور خاص علمی ماحول اور مقام کی بنا پر اقبال کے فلسفہ کو جو خصوصیات حاصل ہوئی ہیں وہ آج سے پہلے کسی مسلمان فلسفی کے فلسفہ کو حاصل نہ ہو سکتی تھی اور نہ حاصل ہو سکی ہیں۔

اقبال کے امتیازی مقام کی وجوہات

پہلی بات تو یہ ہے کہ اقبال کے اس زمانہ میں حکمائے مغرب کی تحقیق و تجسّس کی بدولت علم کے تینوں شعبوں یعنی طبیعات، حیاتیات اور نفسیات میں علمی حقائق نے اس سرعت سے ترقی کی ہے کہ اس سے پہلے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ ترقی سائنس کے اس خاص اسلوبِ تحقیق کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے جو اشیاء کے خواص و اوصاف کے مشاہدہ کی بنا پر پوری احتیاط کے ساتھ صحیح صحیح علمی نتائج مرتب کرنے پر زور دیتا ہے۔ یہ اسلوبِ تحقیق سب سے پہلے خود مسلمانوں نے قرآن کی راہ نمائی میں ایجاد کیا تھا لیکن محققین یورپ نے اس سے متواتر کام لیا اور اس کا میٹھا پھل علمی حقائق کے ایک بیش بہا ذخیرہ کی صورت میں جسے ہم سائنس کہتے ہیں دستیاب ہوا ہے پھر اس دور میں علمی تحقیق و تجسّس کی کامیاب تحریک انسان اور کائنات کو ایک کل یا وحدت کی حیثیت سے سمجھنے کی مختلف کوششوں میں نمودار ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس زمانہ میں بہت سے فلسفے وجود میں آئے ہیں جن میں سے ہر ایک نے دریافت شدہ علمی حقیقتوں کو حقیقتِ عالم کے کسی تصور کے ساتھ ان کے مرکز یا محور کے طور پر وابستہ کرنے کی کوشش کی ہے یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے حقیقت عالم کا غلط تصوّر قائم کیا ہے اور اس کے اردگرد حقائق علمی کی تنظیم بھی غلط طور پر کی ہے۔ سائنس کے خاص اسلوب تحقیق کی وجہ سے فلسفہ کی دنیا میں ایک نیا طرز استدلال وجود میں آیا ہے جس میں اس بات پر بالخصوص زور دیا جاتا ہے کہ کوئی حقائق نظر انداز نہ ہونے پائیں۔ حقائق کا معائنہ کامل احتیاط سے کیا جائے اور نتائج وہی اخذ کیے جائیں جو ناگزیر ہوں اور یہ طرز استدلال علمی دنیا میں آئندہ کے لیے ایک مستقل حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اقبال نے ایک

عرصہ تک یورپ میں رہ کر تعلیم پائی ہے اور اس دوران میں جیسا کہ وہ خود کہتا ہے وہ یورپ کی علمی ترقیات اور حکمتِ مغرب کی خصوصیات سے پوری طرح متاثر ہوا ہے۔

خرد افسزود مرا درسِ حکیماں فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

علمی تحقیق و تجسّس کی اروپائی تحریک نے اقبال کو بھی آمادہ کیا ہے کہ وہ انسان اور کائنات کو ایک کل کے طور پر سمجھے لیکن اقبال کی یہ آمادگی اس کے مخصوص نفسیاتی ماحول کی وجہ سے مغرب کے باطل فلسفوں میں ایک اور غلط مشرقی فلسفہ کے اضافہ کا موجب نہیں ہوئی بلکہ ان باطل فلسفوں کے خلاف اور ان فلسفوں کے زہر سے انسانیت کو بچانے کے لیے ایک مہربانِ قدرت کے مفید اور کامیاب ردِّ عمل کی صورت اختیار کر گئی ہے بالکل اسی طرح جیسے کہ ایک جسم حیوانی کے اندر ایک مہلک مرض کے جراثیم کے داخل ہونے ترقی پانے اور زہر پیدا کرنے کے بعد جسم حیوانی کے نمو اور تحفظ کے لیے کارفرما ہونے والی قوّت حیات ایک ردِّ عمل کرتی ہے اور ضد سرایت (ANTI TOXIN) مواد پیدا کر کے جراثیم کی ہلاکت اور جسم انسانی کی صحت کا اہتمام کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اقبال کے ذریعہ سے قدرت نے ایک ایسے فلسفہ کو نمودار کیا ہے جس کی روشنی میں نہ صرف مغرب کے موجودہ غلط فلسفوں کی نامعقولیت آشکار ہو جاتی ہے بلکہ جس کے اندر قیامت تک پیدا ہونے والے تمام غلط فلسفوں کا کافی اور شافی جواب اور ابطال بالقوہ موجود ہے۔ لہٰذا یہی فلسفہ ہے جو آگے چل کر پوری نوعِ انسانی کا فلسفہ بننے والا ہے۔ قدرت کی عادت ہے کہ جب انسانوں کی قدرتی بدنی یا روحانی ضروریات کی تشفی میں کوئی شدید رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اپنی مہربانی سے اس رکاوٹ کو دُور کرنے اور از سرِ نو انسانوں کی بدنی اور روحانی پرورش کے لوازمات مہیا کرنے کے لیے ایک معجزانہ قدم اٹھاتی ہے اسی عادت کی وجہ سے جسم حیوانی مرض کے خلاف ردِّ عمل کر کے صحت مند ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ جب غلط نظریات اور تصورات اشاعت پذیر ہو کر عالمِ انسانی کو غلط راہوں پر لیے جا رہے ہیں تو اس میں ایسے داناؤں، مفکّروں اور راہنماؤں کا ظہور ہوتا ہے جو ان غلط تصورات کا ابطال کر کے انسانیت کو زندگی کے صحیح راستوں

پر واپس لاتے ہیں۔

اقبال کا مخصوص نفسیاتی ماحول

اقبال کے مخصوص نفسیاتی ماحول نے ممکن بنایا ہے کہ وہ اپنے فلسفہ کی بنیاد حقیقتِ کائنات کے صحیح تصوّر پر رکھے اس نفسیاتی ماحول میں اس کا مسلمان ہونا اور پھر مسلمانوں میں بھی تصوف، زہد اور ریاضت کا ذوق رکھنے والے ایک خاندان کا فرد ہونا، ارباب نظر اور اہل دل بزرگوں کی صحبت سے شغف رکھنا اور اس کی جستجو کرنا حتیٰ کہ اس کے حصول کے لیے کسی موقع کو نظر انداز نہ کرنا اس سے متواتر مستفید ہوتے رہنا، عربی اور فارسی کے علوم اور اسلام کے علماء حکماء اور صوفیاء کی کتابوں کے مطالعہ کا ذوق رکھنا ایسے عناصر شامل ہیں۔ اس ماحول نے اسے نبوّت کے عطا کیے ہوئے صحیح تصوّرِ کائنات کے وجدان سے آشنا ہی نہیں کیا بلکہ اس تصوّر کے حسن و جمال کے ایک طاقتور قلبی احساس یا عشق کو بھی پروان چڑھایا ہے۔

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

یہی سبب ہے کہ وہ کہتا ہے:

مے نہ روید غم دل از آب و گل،
بے نگاہے از خدا دندانِ دل

اقبال بنیادی طور پر ایک صوفی یا درویش ہے شاعر یا فلسفی نہیں

افسوس ہے کہ اقبال کے غیر مبہم الفاظ میں بار بار کہنے کے باوجود ہم بالعموم اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ گو اقبال ایک شاعر بھی ہے اور ایک فلسفی بھی تاہم بنیادی طور پر وہ نہ فلسفی ہے اور نہ شاعر بلکہ ایک درویش یا صوفی ہے اس کا شاعرانہ کمال اور اس کا حکیمانہ جوہر دونوں اس کے وجدان یا عشق کے خدمت گزار ہیں۔ اس کی ساری ذہنی کاوشوں کا حاصل یہ ہے کہ اس نے فلسفہ کی معروف اور دورِ حاضر کے انسان کے لیے قابلِ فہم زبان میں اپنے روحانی تجربہ

یا عشق کی ترجمانی کی ہے اور اس عمل کے دَوران میں جو فلسفیانہ افکار و تصوّرات اس کے ہاتھ لگے ہیں ان کو شعر کے زوردار اور پُراثر طرزِ بیان کا جامہ پہنایا ہے۔ دوسرے شاعروں کی طرح محبّتِ مجاز کی داستانوں اور غزلوں سے سننے والوں کا دل لبھانا اس کا مدعا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعر کے لقب کو جو بعض وقت اس کے نادان دوست اس پر چسپاں کرتے ہیں بڑے زور سے ردّ کرتا ہے:

نہ پنداری کہ من بے بادہ ستم
مثالِ شاعراں افسانہ بستم
مدار امید زاں مردِ فرو دست
کہ برمن تہمتِ شعر و سخن بست

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار مے کشم ناقۂ بے زمام را

او حدیثِ دلبری خواہد زمن — رنگ و آب شاعری خواہد زمن
کم نظر بے تابیِ جانم ندید — آشکارم دید و پنہانم نہ دید

اقبال مولانا سلیمان ندوی کو اپنے ایک خط مورخہ ۴ اگست ۱۹۱۲ء میں لکھتے ہیں:

"مَیں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات اور روایات کی رُو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے:

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست
کہ برمن تہمتِ شعر و سخن بست"

اِسی طرح اپنے ایک خط مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۱۳ء میں خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں:

"آپ کو معلوم ہے کہ میں اپنے آپ کو شاعر تصور نہیں کرتا اور نہ کبھی بحیثیت فن کے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ پھر میرا کیا حق ہے کہ میں صفِ شعراء میں بیٹھوں۔"

اوپر یہ ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح سے اقبال اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ تمام ایسے فلسفے جو خدا کی محبت یا بالفاظِ دیگر حقیقتِ کائنات کے صحیح تصور سے عاری ہوں اور لہٰذا حقیقت کے غلط یا ناقص تصورات پر مبنی ہوں بے ہودہ اور بیکار ہیں اگر اقبال خود خدا کی محبت سے بہرہ ور نہ ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ وہ کبھی اس قسم کی حکیمانہ نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے اور یہ ہمارا قیاس ہی نہیں بلکہ خود اقبال کا دعویٰ بھی ہے کہ اسے روحانیت کا ایک درجہ اور معرفت حق تعالیٰ کا ایک مقام عطا کیا گیا ہے اس درجہ معرفت اور مقام محبت کو وہ افروزش سینہ سوز درون۔ ذوقِ نگاہ۔ بادۂ ناب وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتا ہے اور اپنے لیے درویش، فقیر، قلندر ایسے القاب استعمال کرتا ہے جو صوفیا کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر داناے راز آید نہ آید

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قارون ہے لغت ہاے حجازی کا

اے پسر ذوقِ نگاہ از من بگیر
سوختن در لاالہ از من بگیر

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسہ میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر بعد من ناید چو من مردِ فقیر

عصرِ حاضر را خرد زنجیر پاست
جانِ بیتابے کہ من دارم کجاست
اعجمی مردے پر خوش شعرے سرود سوزد از تاثیر او جان در وجود

جوہرِ انسانی کے اوصاف و خواص

جہاں اقبال کے نفسیاتی ماحول نے اُسے خدا کی محبت سے بہرہ ور کیا ہے وہاں اس کے جدید علمی ماحول نے اسے اس قابل بنایا ہے کہ انسان کے انفرادی اور اجتماعی افعال و اعمال کے متعلق اپنے ان نظریات اور معتقدات کی علمی اور عقلی بنیادوں کو معلوم کر سکے جو اسے قرآن سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اس علمی ماحول کی وجہ سے اس پر یہ بات منکشف ہوئی ہے کہ یہ نظریات اور معتقدات جوہرِ انسانی کے قدرتی اوصاف و خواص پر مبنی ہیں۔ وہ جوہرِ انسانی کو خودی کی حکیمانہ اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور ایک سائنس دان کی طرح روزمرّہ کے مشاہدات کی روشنی میں اس کے عملی اثرات و نتائج کا جائزہ لیتا ہے اور ان کی روشنی میں اس کے قدرتی اور ازلی اور ابدی اوصاف و خواص کی تشریح کرتا ہے۔ یہ محض اتفاق کی بات ہے اور اتفاق علمی اور عقلی نقطۂ نظر سے قرآن حکیم کی صداقت کی دلیل ہے کہ یہ اوصاف و خواص قرآن کی تعلیمات

کے عین مطابق ہیں یہی وجہ ہے کہ اقبال کا فلسفۂ خودی ایک طرف سے انسان کی سائنس ہے اور دوسری طرف سے قرآنِ حکیم کی تفسیر ہے جس طرح سے ہم کارل مارکس کے فلسفہ کو اس تصوّر سے الگ نہیں کر سکتے کہ کائنات کی حقیقت مادہ ہے۔ اس طرح سے ہم اقبال کے فلسفہ کو اس تصوّر سے الگ نہیں کر سکتے کہ کائنات کی حقیقت خدا ہے۔ خدا کی ان صفات کے ساتھ جو نبوتِ کاملہ کی تعلیمات ——— میں بیان کی گئی ہیں۔ اقبال کی حکمت میں خدا کا اسلامی تصور جو اسے اس مخصوص نفسیاتی ماحول سے ملا تھا محض ایک عقیدہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسی علمی حقیقت کے طور پر پیش ہوا ہے جو انسانی جوہر کے اوصاف وخواص سے ایک ناگزیر نتیجہ کے طور پر اخذ ہوتی ہے اور جس کے ڈانڈے تمام دوسرے علمی اور عقلی تصورات یعنی طبیعات، حیاتیات اور نفسیات کے حقائق سے جا ملتے ہیں نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اقبال کے ہاں حقیقتِ انسان کا مسئلہ فقط وحی کی روشنی میں ہی نہیں بلکہ جدید علمی حقائق کی روشنی میں اور جدید طرزِ استدلال کی مدد سے حل ہوا ہے۔ اقبال کی حکمت میں یہ بات پہلی دفعہ آشکارا ہوئی ہے کہ خدا کا تصور تمام علمی حقائق کے ساتھ اور انسان کی زندگی کے تمام ضروری شعبوں کے ساتھ کیا علمی اور عقلی مناسبت رکھتا ہے اور اس تصوّر کی یہ مخفی استعداد کہ صرف کائنات کے تمام موجودہ اور آئندہ حقائق کی معقول تشریح اور مکمل تنظیم کر سکتا ہے علمی تحقیق و تجسّس کے دائرہ میں آگئی ہے اور یہ مذہب اور علم دونوں کی بہت بڑی ضرورت ہے۔

مذہب ایک سائنس کب بنتا ہے

مذہب انسان و کائنات کے متعلق کچھ معتقدات کو ضروری سمجھتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ معتقدات کون سے ہیں اور کیوں ضروری ہیں، اور کون سے اور کیسے اعمال کا تقاضا کرتے ہیں۔ مذہبی معتقدات کے لیے جس حد تک کہ وہ صرف مذہبی معتقدات ہیں یہ ضروری نہیں کہ علمی حقائق کے ساتھ مطابقت بھی رکھیں یا علمی اور عقلی معیاروں کی رُو سے درست بھی ثابت ہو سکیں سائنس بھی حقیقتِ انسان و کائنات کے متعلق کچھ معتقدات پیش کرتی ہے اور ہم جان لیتے ہیں کہ یہ معتقدات ہماری زندگی کے مقاصد کے پیشِ نظر کون سے اور کیسے اعمال کا تقاضا کرتے

ہیں لیکن سائنس کے معتقدات اشیاء کے قدرتی اوصاف وخواص پر مبنی ہوتے ہیں اور تجربات اور مشاہدات سے معلوم کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ علمی حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور علمی اور عقلی معیاروں کے مطابق درست تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اگر کسی وقت اشیاء کے اوصاف اور خواص کے علم کی ترقی کی وجہ سے کسی مذہب پر ایک دور ایسا آجائے کہ اس کے معتقدات بھی اشیاء کے قدرتی اوصاف اور خواص پر مبنی ہو جائیں تو پھر وہ مذہب سائنس بن جاتا ہے اور اس میں اور سائنس میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اقبال پہلا مسلمان فلسفی ہے جس نے بتایا ہے کہ مذہب اسلام کے معتقدات ایک خاص چیز کے قدرتی اوصاف وخواص پر مبنی ہیں جن کے علم کی طرف انسانی زندگی کے وہ حقائق جو مشاہدات پر مبنی ہیں راہ نمائی کرتے ہیں اور وہ چیز انسانی انا یا خودی ہے لہٰذا اقبال کے فلسفہ میں مذہب اسلام ایک سائنس کی صورت اختیار کر گیا ہے اور یہی اقبال کی سب سے بڑی علمی خدمت ہے۔ اسلام کا یہ قدم جو آگے کو اُٹھ چکا ہے اب واپس نہیں آسکتا بلکہ اسی سمت میں اس سے بھی اگلے قدموں کی طرف راہ نمائی کرے گا۔ اب آئندہ جو بھی حقائق علمی دریافت ہوتے جائیں گے۔ اسلام کی سائنس کے عناصر بنتے جائیں گے۔ اب اس بات کی ضرورت نہیں رہی کہ اسلام کو ایک نظامِ افکار کی شکل دینے کے لیے تصوّف کے ان مفروضات کا سہارا لیا جائے جو قرونِ وسطیٰ کے صوفیوں نے ایجاد کیے تھے اور جنہیں اب تک حکمتِ اسلام کے عناصر خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اقبال خود لکھتے ہیں:

> "اب اسلام قرونِ وسطیٰ کے اس تصوّف کی تجدید کو روا نہ رکھے گا جس نے اس کے پیروؤں کے صحیح رجحانات کو بگاڑ کر ایک مبہم تفکر کی طرف اس کا رُخ پھیر دیا تھا اس تصوّف نے گزشتہ چند صدیوں میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو اپنے اندر جذب کر کے سلطنت کو معمولی آدمیوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا تھا۔ جدید اسلام اس تجربہ کو دہرا نہیں سکتا۔ اسلام جدید تفکر اور تجربہ کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے اور اب کوئی ولی یا پیغمبر بھی اس کو قرونِ وسطیٰ کے تصوف کی تاریکیوں کی طرف واپس نہیں لے جا سکتا۔"

اصطلاحِ خودی کی برکتیں

جوہرِ انسانی کے لیے خودی کی حکیمانہ اصطلاح کو کام میں لانے سے فطرتِ انسانی کے صحیح اسلامی تصوّر کے ساتھ علمی حقائق کی مطابقت علمی تحقیق اور عقلی محاکمہ کے دائرہ میں آگئی ہے اور اقبال کے فلسفہ میں یہ صلاحیت پیدا ہوگئی ہے کہ حال اور مستقبل کے تمام صحیح علمی حقائق کو اپنے اندر جذب کرسکے چونکہ خودی کا تصور صحیح ہے اور سائنسی حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن حقائق کو سائنسدان تجربات اور مشاہدات کے ایک طویل عمل کے بعد دریافت کرتا ہے۔ اقبال ان کو بلا دقّت اور نہایت آسانی کے ساتھ خودی کی فطرت سے اخذ کرتا ہے اس قسم کے تصورات میں سے ایک ارتقا کا تصور ہے جس کا سبب (CAUSE) اقبال کے ہاں خودی کی فطرت سے ماخوذ ہے اور جس کا طریقہ بھی ہم نہایت آسانی کے ساتھ خودی کی فطرت سے اخذ کرسکتے ہیں۔

اس بیسویں صدی میں علم کے ہر شعبہ میں سچی علمی حقیقتوں کی تعداد یہاں تک ترقی کرگئی ہے کہ جب ہم حکمتِ اقبال کے اندرونی تصوّرات کو ایک عقلی یا منطقی ترتیب کے ساتھ آراستہ کرنے کی کوشش کریں اور اس سلسلہ میں ان حقیقتوں کو اس ترتیب کے خلاؤں کو پُر کرنے کے لیے کام میں لانا چاہیں تو علمی حقیقتوں کی کوئی ایسی کمی محسوس نہیں کرتے جو ہماری کوششوں کو کامیابی سے باز رکھ سکے۔ بلکہ ہماری کوششیں یہاں تک کامیاب ہوتی ہیں اور خلاؤں کی تعداد و طوالت یہاں تک کم ہوجاتی ہے کہ ترتیب سچ مچ ایک مسلسل عقلی یا منطقی نظام کی شکل اختیار کرلیتی ہے اور پھر یہ کام اس بنا پر اور آسان ہوجاتا ہے کہ سچی علمی حقیقتوں کے موجودہ ترقی یافتہ مواد ہی سے بعض ضروری علمی حقیقتیں اقبال کی حکمت کے اندر خود اقبال کے ہاتھوں سے پہلے ہی داخل کردی گئی ہیں۔ ان اندرونی حقیقتوں کی وجہ سے اقبال کی حکمت کے ساتھ بیرونی علمی حقیقتوں کی علمی اور عقلی مناسبت اور مطابقت نہایت آسانی کے ساتھ واضح ہوگئی ہے جس سے اس حکمت کے اندرونی حصّوں کو بیرونی حصّوں کے ساتھ جوڑنے کا کام آسان ہوگیا ہے۔

فلسفۂ خودی کائنات کا آخری فلسفہ ہے

حکمتِ اقبال کی یہی خصوصیات ہیں جو اسے کائنات کا وہ آخری فلسفہ بنا دیتی ہیں جو ہر دَور کے باطل فلسفوں کا مُسکت اور تسلی بخش جواب ہو۔ شاہ ولی اللہ اور محی الدین ابن عربی کے زمانہ میں اس قسم کے فلسفہ کا وجود میں آنا ممکن نہیں تھا۔ آج اگر مسلمان یا کوئی اور قوم جدلی مادیات (DIALECTICAL MATERIALISM) کا معقول علمی جواب دینا چاہے جیسے دَورِ حاضر کا انسان بھی سمجھ سکے تو وہ صرف اقبال کے نظامِ حکمت سے ہی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ کسی اور فلسفہ سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ انسان اور کائنات کی سچّی حقیقت کو سمجھنے کے لیے جس قسم کی ذہنی رکاوٹیں کسی زمانہ میں پیدا ہوتی ہیں قدرت ان رکاوٹوں کو دُور کرنے کے لیے علاج بھی ویسا ہی پیدا کرتی ہے۔ اقبال کا فلسفۂ خودی اپنے مزاج کے لحاظ سے اپنے دَور کے فلسفوں کی تمام ظاہری خصوصیات سے حصّہ لیتا ہے تاکہ ان کا تسلی بخش جواب بن سکے۔ شاہ ولی اللہ اور محی الدین ابن عربی ایسے اکابر کے فلسفے اپنے زمانہ کے باطل فلسفوں کا جواب تھے۔ لیکن اس زمانہ کے یا آنے والے زمانہ کے باطل فلسفوں کا جواب نہیں اور نہ بتائے جا سکتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے اسلامی تصوّر پر مبنی ہونے کے باوجود وہ جدید علمی حقائق کی عقلی اور منطقی حدود کے کسی نکتہ پر بھی نہ ان سے اتصال پیدا کرتے ہیں اور نہ ٹکراتے ہیں لہٰذا ان میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ ایک ایسے جدید نظامِ حکمت کی صورت اختیار کر سکیں جو عقلی اور منطقی طور پر مسلسل ہو اور جس میں حال اور مستقبل کے تمام علمی حقائق سموئے جا سکیں۔ اقبال کے علاوہ دوسرے تمام مسلمان فلسفیوں کے فلسفے، فلسفہ اسلام کے ارتقاء کے وہ مراحل ہیں جو گزر چکے ہیں، اقبال کا فلسفہ ان تمام مراحل سے آگے کا فلسفہ ہے جو گزشتہ مراحل کے تمام حاصلات کو بھی اپنے اندر جمع کرتا ہے لیکن اب گزشتہ مرحلوں میں سے کوئی مرحلہ اس کو ہٹا کر اس کی جگہ نہیں لے سکتا کیونکہ ان میں کوئی فلسفہ ایسا نہیں جو اپنے اندرونی استدلال کو وسعت دے کر ایک جدید انسانی اور اجتماعی فلسفہ بن سکے اور آئندہ عالمگیر ریاست کو اپنے سیاسی یا اقتصادی یا اخلاقی یا تعلیمی یا قانونی یا معاشرتی یا اطلاعاتی نظام کے لیے قابلِ فہم علمی تصوّرات بہم پہنچا سکے۔ یہ نکتہ نہایت ہی اہم ہے اور

جس قدر جلد اس پر ہم حاوی ہو جائیں ہمارے لیے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ کیونکہ اتنا ہی ہم اپنی قوتوں کو اور فلسفوں کی جستجو یا نشر و اشاعت پر صرف کرنے کی بجائے اس فلسفہ کی تفہیم اور نشر و اشاعت کے لیے آزاد کر سکیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمیں قدیم اسلامی فلسفوں کا بھی مکمل مطالعہ کرنا چاہیے لیکن اس لیے کہ دیکھا جائے کہ ان کے اندر کون سے تصوّرات ایسے ہیں جن کے مضمرات یا نتائج جدید فلسفہ اسلام یعنی فلسفۂ خودی کی تنظیم اور ترتیب کے خلاؤں کو پُر کرنے کے لیے عمدہ اور دل نشین طرزِ بیان مہیا کر سکتے ہیں لیکن ضروری ہے کہ ہم ان قدیم فلسفوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ مستقبل میں پوری نوع انسانی کو اپنے دامن میں لینے والا اور زندگی کے نظری اور عملی پہلوؤں کے لیے پوری روشنی پہنچانے والا فلسفہ اسلام صرف ایک ہی ہے اور وہ فلسفۂ خودی ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر اقبال کو یہ کہنا زیب دیتا ہے:

ہیچ کس رازے کہ می گویم نہ گفت
ہمچو فکر من در معنی نہ سفت (جاری ہے)

ڈاکٹر اسرار احمد

نے اپنی دوسری دینی اور علمی خدمات کیساتھ ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں

ایک اصلاحی تحریک

بھی برپا کی اور ــــ خطبۂ نکاح ــــ کو صرف ایک رسم

کی بجائے واقعی تذکیر و نصیحت اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ بنایا

اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تحریر اور ایک خطبۂ نکاح کو دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔

بڑے سائز کے ۴۸ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور،

ہدیہ: ۴ روپے ــــــــ محصول ڈاک علاوہ

مؤلف : ڈاکٹر محمد رفیع الدین
مترجم : ڈاکٹر ابصار احمد

منشورِ اسلام

(۶)

کامل ترین ریاست کی واحد بنیاد صحیح نصب العین ہے

جب محولہ بالا اوصاف سے متّصف افراد مل جل کر ایک اجتماعیت یا ریاست تشکیل دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا ہونا لازمی امر ہے، تو ان کا بحیثیّت اجتماع رویّہ اور کردار بھی صائب اور درست ہوتا ہے۔ ایسی ہیئتِ اجتماعیہ یا ریاست اس قابل ہوتی ہے کہ وہ اپنی خارجی و عملی زندگی کے تمام مظاہر میں، حُسن، خوبی اور صداقت کی اقدار اعلیٰ کو مسلسل جامعیت اور توازن کے ساتھ ابنائے عالم کے سامنے پیش کر سکے۔ جُوں جُوں وقت گزرتا ہے یہ اقدار اس ریاست کے باسیوں کی سیاسی، سماجی، معاشی، اخلاقی، قانونی، تعلیمی، ذرائع ابلاغ عامہ، نظری و فکری زندگی، عسکری طور طریق غرضیکہ زندگی کے ہر گوشے میں نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ایسی ریاست میں معاشی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کی کوئی رمق باقی نہیں رہتی۔ ایسے معاشرے کے افراد خود بھی حریّت اور مساوات کی نعمتوں سے بدرجہ اتم مستفید ہوتے ہیں اور انہیں دوسرے معاشروں کو پیش کرنے کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔ وہ ان تمام بیرونی عناصر کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہتے ہیں جو اُن کی آزادی و حریّت پر ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس ہیئتِ اجتماعیہ یا ریاست میں ایسے کوئی قانون نہیں ہوتے جو اس کے شہریوں کو ان کی مرضی کے خلاف چلنے کو کہیں اور ایسے کوئی سماجی یا تعلیمی اثرات نہیں ہوتے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کی فطرت سلیم کے خلاف ہوں۔ جیسے جیسے یہ شہری اپنے اعلیٰ نصب العین کی صحیح پہچان اور محبّت اور اس کے لیے جذبۂ خدمت حاصل کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کے زیر اثر ان کی باہمی محبّت و اُلفت بھی بڑھتی جاتی ہے، ریاست اسی طور پر داخلی استحکام و تنظیم اور قوّت و جذبۂ عمل میں اعلیٰ ترین درجہ

حاصل کرتی چلی جاتی ہے۔ نتیجتاً یہ کامل ترین، اور خوشحال و پُرمسرت افراد کی اجتماعیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس طرح یہ ایک ایسی کامل ریاست کا نمونہ پیش کرتی ہے جو ہر قابل تصور بُرائی و نقص سے پاک اور ہر خوبی و کمال سے متصف ہو۔ ان کے نظریۂ حیات کی ماہیت ان کے پیہم پُرمسرت اور رُو بہ ترقی وجود کی ضمانت ہے۔ گویا اعلیٰ ترین اجتماعی وجود ان کے مبنی برصداقت فلسفۂ حیات کا نتیجہ ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ج وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَشْتَھِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَا مَا تَدَّعُوْنَ ○ حٰمٓ السَّجْدَۃ: ۳۰، ۳۱)

یقیناً جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ (اس پر) قائم رہے، ان پر فرشتے اتریں گے (اور کہیں گے) کہ نہ خوف کرو اور نہ غمناک ہو اور بہشت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے خوشی مناؤ۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست تھے اور آخرت میں بھی (تمہارے رفیق ہیں) اور وہاں جس (نعمت) کو تمہارا جی چاہے گا تم کو ملے گی اور جو چیز طلب کرو گے تمہارے لیے موجود ہوگی۔

یہ نظریۂ حیات اس بات کی کامل ضمانت دیتا ہے کہ یہ افراد دشمنوں کے عزائم کے علی الرغم نہ صرف اپنا وجود مسلسل برقرار رکھیں گے بلکہ دنیا میں ہر اعتبار سے ترقی کریں گے اور پھلے پھولیں گے۔ بفحوائے آیت قرآنیہ۔

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ ○ تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّھَا ط (ابراھیم: ۲۴، ۲۵)

اللہ (تعالیٰ) نے پاکیزہ بات کی مثال بیان فرمائی ہے جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط ہو اور شاخیں آسمان میں۔ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دے رہا ہو۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ج (ابراھیم: ۲۷)

ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا و آخرت، دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ط (البقرۃ: ۲۵۶)

پس جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔

صحیح نصب العین پر تشکیل شدہ ریاست ہی مخالفانہ نظریاتی جنگ و جدال سے نبرد آزما ہو سکتی ہے

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا اسلامی ریاست اگر صحیح خطوط پر واقعتاً مشکل ہے تو اسے رفتہ رفتہ چار دانگ عالم میں پھیل جانا چاہیئے اور پوری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہیئے۔ نظریۂ حیات کی باہمی مناقشت میں اسلامی نظریۂ حیات کی آخری اور مکمل کامیابی مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر ہے۔

ا۔ اس ریاست کی شہریت محدود نہیں ہے یعنی یہ کسی خاص خطّے، نسل، زبان یا رنگ سے مختص نہیں ہے، بلکہ اس کی شہریت دنیا کے ان تمام لوگوں کے لیے کھلی ہے جو صحیح نصب العین سے محبت کرتے ہیں اور اس کے لیے جذبہ کار رکھتے ہیں۔

ب۔ چونکہ اس ہیئتِ اجتماعیہ کا نصب العین ہر قسم کی نظری و عملی خرابیوں سے پاک ہے اس لیے اسی کو دنیا میں برتر اور فاتح حیثیت حاصل ہو سکتی ہے۔ غلط اور مبنی بر کذب نظریاتِ حیات اپنی داخلی کمزوریوں اور تضادات کی وجہ سے کہیں بھی قائم نہیں رہ سکتے اور بالآخر ناکامی ان کا مقدر بنتی ہے۔

ج۔ اس ریاست کے جملہ شہریوں کے عمومی اخلاق اتنے بلند اور ان کی شخصیات اتنی مربوط ہوتی ہیں کہ یہی صفات ان کی افواج کے سپاہیوں میں بھی پائی جاتی ہیں اور

ان کی ہمّت و عظمت ہمیشہ بلند رہتی ہے۔

د۔ اس کا نصب العین انسانیت کے ہردم ارتقا پذیر فلسفیانہ اور سائنسی علم سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے نظریۂ حیات کو زیادہ یقین آور، منظم اور سائنسی انداز پر استوار کرتا ہے چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ یہ ریاست ہتھیاروں اور آلات حرب کے ذریعے نہیں بلکہ اپنے بنیادی تصورات کی قوّت کی بنا پر عالمی فتح حاصل کرے گی۔ اس کی فتح انسانیت کے لیے انتہائی مسرت اور اطمینان کا باعث ہوگی کیونکہ یہ اقوام عالم کے درمیان پیکار اور جنگ و جدل کا مکمل طور پر خاتمہ کر کے انہیں ایک مضبوط وحدت میں باندھ دے گی۔ اسلامی ریاست کی کامیابی اللہ کی زمین پر نہ صرف دیرپا امن و آشتی کا باعث ہوگی بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں انسانی ارتقاء کے اعلیٰ ترین اہداف کا حصول بھی ممکن بنائے گی۔

صحیح نصب العین کیونکر انفرادی اور اجتماعی کمال پر منتج ہوتا ہے

یہاں سوال کیا جا سکتا ہے کہ صحیح نصب العین کا تعین کیسے فرد اور اجتماع کو یکسر بدل دیتا ہے اور انہیں کمال اور اعلیٰ ترین سطح پر لے آتا ہے؟

دراصل حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی بھی صحیح نصب العین کو اپنے فکر و عمل میں اختیار کرتا ہے تو وہ خود بخود یا بالفاظ دیگر اپنے نصب العین کی قوت سے اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ اس طور عمل کرے جو اس کی داخلی بالیدگی کی ضمانت دے۔ اور یہی چیز خارج میں اپنے خالق حقیقی کے ساتھ محبت و تعلق کے اظہار کا سبب بن کر اس کی صفات حسنہ یعنی حسن و کمال کی جامع ترین معروضی صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور یوں صحیح نصب العین انفرادی اور اجتماعی سطح پر مکمل ترین وجود کا باعث بنتا ہے۔

ایمان، محبّت، خود آگاہی، خود شعوری یا معرفتِ خالق

جس لمحے ہی ایک شخص انبیاء کرام کی دعوتِ حق پر لبیک کہتا ہے اور اعلیٰ اوّدس الاشہاد اعلان کرتا ہے کہ صحیح نصب العین ہی اس کی فطرت کا اعلیٰ ترین نصب العین اور ہدف ہے

وہ اپنے خالقِ حقیقی کے مکمل حسن وخوبی کا ادراک حاصل کرلیتا ہے اور دوسرے تمام باطل نصب العینوں میں حسن وخوبی کی غیر موجودگی بھی اس پر واضح ہوجاتی ہے۔ حسن ازلی کی چمک پہلی بار اس کے حیطہ بصیرت میں آتی ہے اور خالق حقیقی سے محبت کا جذبہ پہلی بار اس کے سینے میں موجزن ہوتا ہے۔ معرفت خداوندی بھی پہلی بار صحیح طور پر اس پر آشکارا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ کے وجود وصفات کی نوعیت کیا ہے اور اس کا تعلق اس کی زندگی سے کیا ہے!! اور صحیح خودشناسی بھی اسے پہلی بار نصیب ہوتی ہے۔ اس کا مطلوب حقیقی کیا ہے اور اس کی زندگی کا اصل مطمع نظر اور مقصد کیا ہے!! چنانچہ اس کا اعتقاد اس کے جذبہ محبت اور معرفتِ خودی وخدا کے مترادف ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا ایمان، خودشناسی اور خالق حقیقی کی معرفت اور اس کا عشق کے ہم معنی ہے۔ ازاں بعد یہ صادق جذبہ محبت اگر صحیح خطوط پر پروان چڑھتا رہے اور اس کی مسلسل نگہداشت کی جائے تو یہ پیہم مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جاتا ہے اور اپنی خودی کے اعلیٰ ترین ارتقار کا باعث بنتا ہے۔ اس نقطۂ عروج پر انسانی خودی انبساط، اطمینان، خود اعتمادی اور خود انضباطی کی وہ اعلیٰ ترین سطح حاصل کرلیتی ہے جس کی یہ اہل ہے اس کا جذبہ محبت جوں جوں بڑھتا اور خالص تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کا اعتقاد بھی اتنا ہی گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کی معرفتِ خداوندی اور علم ذات بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کی کیفیتِ انبساط، خود انضباطی اور خود اعتمادی میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جذبہ محبت (عشق) کو اگر پورے طور پر اور مسلسل اظہار کا موقع نہ دیا جائے تو اس کے ثمرات حاصل نہیں ہوتے اور اگر کوئی منہ زور نفسانی خواہش ابھر کر اس کا رُخ غیر فطری سمت میں موڑ دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جذبہ کی صحیح طور پر نگہداشت نہیں کی جارہی۔ ہم آئندہ صفحات میں دیکھیں گے کہ جذبہ محبت (عشق) کے مکمل اور آزادانہ اظہار کے لوازم کیا کیا ہیں اور یہ کہ نفسانی خواہش کی اصل ماہیت کیا ہے اور یہ کس طرح عاشق کی روحانی زندگی میں نقصان کا باعث بنتی ہے۔

نصب العین کیلئے محنت۔ (عبادت)

صحیح نصب العین کی محبت جس عمل اور کوشش پر ابھارتی ہے وہ داخلی بھی ہے اور خارجی

بھی۔ داخلی یا ذہنی عمل آیات و تماثیل کے ذریعے خالقِ حقیقی کی صفات پر تدبّر و تفکّر کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ تدبر و تفکر ہمیشہ ان صفات قدسیہ کی حمد و تعریف پر منتج ہوتا ہے اور جس قدر کوئی فرد جذبہ محبّت اور خود شناسی کی دولت سے مالا مال ہے، اتنی ہی یہ حمد و تعریف گہری ہوتی ہے۔ صفاتِ خداوندی کی وہ آیات و تماثیل جو ان صفات پر غور و تفکر کا ذریعہ بنتی ہیں دو قسم کی ہیں۔

ا۔ وہ مظاہر قدرت جن میں خالق اپنی صفات کا اظہار کرتا ہے۔

ب۔ وہ الفاظ جو حق تعالیٰ کی صفات کو بیان کرتے ہیں۔

صفاتِ حُسن کا مطالعہ

ا۔ مظاہر قدرت کے ذریعے۔ (فکر)

چونکہ عالم فطرت ذاتِ خداوندی کی تخلیق ہے، اس لیے اس میں الوہی صفات کا اظہار پایا جاتا ہے۔ آسمانوں، سورج، چاند ستارے، پہاڑ، زمین، وسیع و عریض سمندر، طلوع و غروب آفتاب کا منظر، بادل، دریا، ندیاں، ہوائیں، دن اور رات کا اُلٹ پھیر، موسموں کا تغیر و تبدل، حیوانی اور نباتاتی زندگی کی بوقلمونی و کثرت ـــــ غرضیکہ مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی سطح پر قدرت کے مختلف النوع شاہکار اپنی تمام تر تخلیق، افزائش، رنگ و نسل کی تفریق، عادات و خصائل اور حرکات و افعال کے اعتبار سے اپنے خالق کی صفات کا اسی قدر مظہر ہیں جس طرح آرٹ کا ایک شاہ پارہ اپنے خالق آرٹسٹ کے اخلاقی اور ذہنی سانچے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ان مظاہر کا بنظرِ عمیق مطالعہ ایک صاحب ایمان شخص کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ خالق کی صفات پر زیادہ بہتر طور پر تدبر و تفکّر اور ان کی تعریف و تحمید کر سکے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ (الذّٰریٰت:۲۰)

اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں،

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ

اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج
سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (اٰل عِمرٰن: ۱۹۰، ۱۹۱)

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں (اُن) ہوشمند لوگوں کے لیے (بہت) نشانیاں ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان اور زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) "پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے (اس سے کہ عبث کام کرے) پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

مطالعہ فطرت جسے اسلامی اصطلاحات میں 'فکر' کا نام دیا جاتا ہے، نہ صرف صحیح نصب العین کے لیے محبّت کے اظہار اور اس کی نشوونما کا ذریعہ ہے، بلکہ تمام انسانوں میں اس محبّت کا بیج بونے کا محرک بھی ہے۔ چونکہ ہم سب اپنی حیات دنیوی کے پُورے عرصے میں اس فطرت کے درمیان رہتے ہیں اس لیے ہم میں ہر شخص مظاہر فطرت پر غور و تدبر اور اس کے حسن و جمال کی تعریف پر مجبور ہے۔ نتیجتاً ہم میں سے ہر فرد ایک خالق کی صنّاعی، عظمت، خوبی، حسن و جمال اور طاقت و قدرت کا احساس حاصل کرنے پر مجبور ہے چاہے ہم میں سے چند افراد میں یہ احساس قدرے دُھندلا ہی کیوں نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارا عقیدہ اور مذہب خواہ کچھ ہی ہو، ہم اکثر فطرت کے بارے میں گفتگو ایک شخصی وجود کی حیثیّت سے کرتے ہیں جس کا اپنا ایک کردار ہے اور جو اپنی جملہ کارگزاریوں کا شعور رکھتا ہے۔ اور ان افعال و وظائف کا کوئی مقصد و ہدف ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ہم میں اکثر اس احساسِ حُسن کی اہمیّت کا اندازہ نہیں لگاتے۔ ظاہر ہے کہ یہ احساس باقی تمام اقسام احساس کی طرح مناسب تفہیم اور اظہار کا متقاضی ہے۔ اور یہ لوگ اسی کا اہتمام نہیں کرپاتے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ

عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ (یوسف : ۱۰۵)

اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔

اس کا عملاً نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ذہن کی شعوری سطح پر ہم سے اکثر لوگوں میں یہ احساس کچل دیا جاتا ہے لیکن چونکہ اس کی وجہ جواز ہماری فطرت کا حصہ ہے اور یہ ہماری ہستی کے طاقتور ترین جذبے سے نہ صرف مطابقت رکھتا ہے بلکہ اس کے اظہار کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ یہ جذبہ کبھی بھی پورے طور سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ہوتا یہ ہے کہ اسے وقتی طور پر صرف دبا کر غیر شعوری سطح پر دھکیل دیا جاتا ہے جہاں یہ ایک چنگاری کی صورت ہمیشہ محفوظ رہتا ہے۔ چنانچہ اس طرح حقیقی ملحد کا وجود ممکن نہیں۔ ایک ایسا شخص جسے عام طور پر ملحد کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، الفاظ اور عمل میں کھلے بندوں خدا کا انکار کرتا ہے لیکن چونکہ اس کا بھی فطرت سے ناگزیر تعلق ہے اس لیے اپنے نہاں خانہ دل میں وہ بھی اس کے حسن و جمال کا ایک گہرا مگر غیر شعوری احساس رکھتا ہے اور اس طرح حقیقتاً خدا کے وجود کا اعتراف کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ نامساعد حالات اور تکالیف میں گھر جاتا ہے تو دعا اور مناجات ہی کا سہارا لیتا ہے۔

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ○

(لقمٰن : ۳۲)

اور جب اُن پر (دریا کی) لہریں سائبانوں کی طرح چھا جاتی ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اسے پکارنے لگتے ہیں۔ پھر جب وہ انہیں نجات دیکر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو بعض ہی انصاف پر قائم رہتے ہیں۔ اور ہماری نشانیوں سے وہی انکار کرتے ہیں جو عہد شکن (اور) ناشکرے ہیں۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ

فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۝

(العنکبوت : ۶۵)

پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اُس سے دعا مانگتے ہیں، پھر جب وہ انہیں بچا کر خشکی پر لے آتا ہے تو یکایک یہ شرک کرنے لگتے ہیں۔

جب ایک رسول دنیا میں آتا ہے تو وہ کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو انسانیت کیلئے نئی یا اجنبی ہو، بلکہ اس احساس حُسن کو جگاتا اور زندہ کرتا ہے جو ان کے دلوں میں پہلے ہی دبا ہوا موجود ہوتا ہے۔ وہ اس سے پہلے ہی واقف ہوتے ہیں۔ رسول و انبیاء اس جذبے اور احساس کو مزید نکھارتے اور اس کے حقیقی مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ اور اس کے اظہار کا صحیح طریقہ سکھاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے پیغمبرانہ کام کا آغاز لوگوں کو مطالعہ فطرت کی دعوت سے کرتے ہیں۔ وہ فطرت چہار اطراف سے ان کے مشاہدے میں آتی ہے اور ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ کیا یہ مظاہر فطرت اپنے اندر ایک خالق کی صفات محبت، حُسن، حکمت اور قدرت کے واضح دلائل نہیں رکھتے؟ اور کیا یہ انسان کو محبت، تشکر اور حمد و ثنا کے جذبات میں ایک خدائے مُطلق کے سامنے جھکنے پر مجبور نہیں کرتے؟ حقیقت یہ ہے کہ صرف ان اوصاف حمیدہ سے متصف خدائے لایزل ہی انسانیت کا سچا نصب العین ہو سکتا ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ج فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

(العنکبوت : ۶۱)

اور اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کر رکھا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر یہ کدھر سے اُلٹے جا رہے ہیں؟

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ

الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ط قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ط
بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ (العنکبوت : ۶۳)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے مُردہ پڑی ہوئی زمین کو جِلا اٹھایا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو الحمدللہ، مگر اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ
السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ
وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ
اللّٰهُ ج قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ج
فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ج فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○

(یونس : ۳۱-۳۲)

ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظمِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو، پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے؟ تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے۔ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو؟

قرآن حکیم بار بار اور مختلف اسلوب میں بنی نوع انسان کو مظاہرِ فطرت کے مشاہدہ و مطالعہ کی دعوت دیتا ہے اور ان کی توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کراتا ہے کہ یہ مظاہرِ فطرت اپنے خالق کی صفاتِ حُسن و کمال کی کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ
وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ
النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ص وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ (البقرة : ۱۶۴)

یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، ان لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ○ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○

(الرّوم : ۲۰ ، ۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک تم بشر ہو کہ (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ

الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ط قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ط
بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ (العنکبوت : ۶۳)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ سے مُردہ پڑی ہوئی زمین کو جِلا اٹھایا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ کہو الحمدللہ، مگر اکثر لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ
السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ
وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ
اللّٰهُ ج قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ج
فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ج فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○

(یونس : ۳۱-۳۲)

ان سے پوچھو، کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جاندار کو اور جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اس نظمِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں کہ اللہ۔ کہو، پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے؟ تب تو یہی اللہ تمہارا حقیقی رب ہے۔ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو؟

قرآن حکیم بار بار اور مختلف اسلوب میں بنی نوع انسان کو مظاہرِ فطرت کے مشاہدہ و مطالعہ کی دعوت دیتا ہے اور ان کی توجہ اس حقیقت کی جانب مبذول کراتا ہے کہ یہ مظاہرِ فطرت اپنے خالق کی صفاتِ حُسن و کمال کی کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ
وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ
النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ص
وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ (البقرة : ۱۶۴)

یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں۔ اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، ان لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ
بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ○ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ
اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ
مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○

(الرّوم: ۲۰، ۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر یکایک تم بشر ہو کر (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ
فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ

يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ
مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○ وَاِنْ كَانُوْا
مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ○
فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ
بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (الرّوم : ۴۸ تا ۵۰)

اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تُو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش وخرّم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے۔ دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ مُردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جِلا اٹھاتا ہے، یقیناً وہ مردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ
اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ○
وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ
مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ○
وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ○ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ
تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ
مِّنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ○ (الرّوم : ۲۲ تا ۲۵)

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لیے اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور تمہارا اس کے فضل کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سُنتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تمہیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔ پھر جونہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارا بس ایک ہی پکار میں اچانک تم نکل آؤ گے۔

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ۝ (الغاشیہ: ۱۷ تا ۲۰)

یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجیب) پیدا کیے گئے ہیں اور آسمان کی طرف کہ کیسا بلند کیا گیا ہے۔ اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح نصب کیے گئے ہیں۔ اور زمین کی طرف کہ کس طرح بچھائی گئی ہے۔

خالق کائنات کے حسن و خلاّقیت کا احساس اجاگر کرنے میں مطالعہ فطرت ایک اہم ذریعہ ہے اور اس کا دائرہ کل تلاشِ علم پر محیط ہے۔ علم کا ہر شعبہ اور اس کی صحت مند جستجو اس میں ممد ہے۔ گویا اس طرح اسلامی اصطلاح میں 'فکر' یا مطالعہ مظاہر فطرت تمام علوم طبعیہ کی بنیاد میں موجود ہے۔ جب مطالعہ فطرت کا عمل باضابطہ ہوتا ہے تو یہی سائنٹیفک ریسرچ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس ریسرچ میں پیہم انہماک ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم وہ قوانین فطرت معلوم کر سکیں جو تخلیق کی تمام سطحوں پر کارفرما ہیں۔ مزید برآں ہم انہیں زیادہ سے زیادہ زندگی کی آسانیوں اور سہولتوں کے حصول کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

ب۔ صفاتِ حُسن کا مطالعہ الفاظ کے ذریعے۔ (ذکر)

اشارات کی دوسری قسم جس کے ذریعے ایک عاشق صفاتِ الٰہیہ کے حُسن و جمال پر تدبر کر سکتا ہے وہ الفاظ ہیں جو ان کو انسانی ذہن پر آشکار کرتے ہیں۔ ان الفاظ کی ایک لسٹ (جنہیں الاسماء الحسنیٰ یا صفاتِ حسنہ بھی کہا جاتا ہے) جو حُسنِ ازل کے خوبصورت صفات کو ظاہر کرتی ہے۔ سطورِ بالا میں دی جا چکی ہے۔ خالقِ حقیقی کی محبت سے سرشار ہو کر ایک صاحبِ ایمان ان میں سے چند صفات کے معانی پر ارتکاز توجہ کرتا ہے تاکہ وہ ان کی اہمیت کو کسی درجے میں جان کر ان کی زیادہ سے زیادہ تحمید و ستائش کر سکے، ان صفاتِ حُسن کو زیادہ سے زیادہ اپنا سکے اور انہیں حرزِ جان بنا سکے۔ اسماءِ حسنیٰ میں سے چند کا انتخاب اس کے کسی وقت کے مزاج یا طبیعت کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ اس باطنی مجاہدہ کے دوران جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ حُسن کی دریافت اور حصول ہے، ایک صاحبِ ایمان ان صفات کا بار بار زبان سے ورد کرتا ہے۔ اور اس عمل میں وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ اس کی توجہ ان الفاظِ صفات کے معانی پر مرتکز رہے۔ یہی عمل دینی اصطلاح میں "ذکر" کہلاتا ہے۔

ذوقِ محبت کے تحت ایک صاحبِ ایمان ہر لمحہ اس حسنِ لایزال سے تعلق قائم کرنے کی سعی کرتا ہے جسے وہ پسند کرتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں کوئی موقع بھی نہیں گنواتا چنانچہ حتی المقدور اور موقع و محل کے مطابق وہ مندرجہ بالا ہر دو قسم کے اشارات کو تفہیمِ حسن میں استعمال کرتا ہے۔ مظاہرِ قدرت اور وہ الفاظ جو خالق کی صفاتِ حسنہ کو بیان کرتے ہیں۔

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى
جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج

(آل عمران: ۱۹۱)

جو اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔

حُسن کی یافت اور معرفت خواہ کسی ذریعے سے ہو، اس کی اصل وہ محبت ہے جو

صاحبِ ایمان کے دل میں ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان ذرائع میں سے کسی کا استعمال بجائے خود ذوقِ محبت کو جلا دیتا ہے۔ اور اس کی افزائش کا باعث ہوتا ہے چنانچہ یہ جزوی طور پر ذوقِ محبت کے آغاز اور اس کے نشوونما کا نتیجہ یا ثمر بھی ہے اور اس کی علت بھی۔ ایک شخص کی اپنے خالق کے لیے محبت جتنی زیادہ ہوتی ہے، وہ اسی قدر اس کی صفات کا مشاہدہ مظاہرِ فطرت میں کرتا ہے۔ اور اسی تناسب سے اس تعالیٰ کے حسن کی تعریف وتحمید بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص جتنے تسلسل اور دلجمعی کے ساتھ صفاتِ خالق کا مطالعہ کرتا ہے، اسی قدر ان صفات کی تعریف وتحمید اس کی نظر میں بڑھتی چلی جاتی ہے اور نتیجۃً اس کا ذوقِ محبت بھی زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح ایک صاحبِ ایمان کی حسن کی محبت اور حسن کی یافت ومعرفت اس کی خود شعوری کے ارتقائی عمل میں ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنتے ہیں۔ (جاری ہے)

ڈاکٹر اسرار احمد
کی تالیف
استحکامِ پاکستان
اشاعتِ خاص ۳۰/، ۲۰/ روپے
اشاعتِ عام ۱۲/ روپے
قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں یا براہِ راست درج ذیل پتہ پر لکھیں
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن
فون: ۸۵۲۶۱۱

پاکستان کیوں بنا — کیسے بنا
پاکستان کیوں ٹوٹا — کیسے ٹوٹا
اب ٹوٹا تو
پاکستان کی تاریخ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ
اندھیروں میں اُمید کی ایک کرن
لفظ لفظ میں — وطن کی محبت
سطر سطر میں — ایمان کی چاشنی
عمل کا پیغام

اس کتاب کا مطالعہ خود بھی کیجئے اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کیجئے

حرم نبوی سے

زیر نظر خط میں مدینۃ النبیؐ سے حضرت شیخ الہند کے ترجمہ قرآن کے پہلے خوش نویس منشی عبدالقیوم صاحب مرحوم و مغفور کے صاحبزادے مولانا محمد عبدالملک جامعی نے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن کی اولین کتابت اور طباعت کے بارے میں بعض اہم تاریخی انکشافات کئے ہیں۔ تاریخی حقائق سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ ایک براہ راست شہادت ہے۔ (ادارہ)

(بسلسلہ مجلہ حکمت قرآن بابت ماہ مارچ ۸۷ء صفحہ ۲۹)

حضرت شیخ الہند کا ترجمہ قرآن مجید "۲۰ء کے لگ بھگ" نہیں بلکہ ۲۵ء میں شائع ہوا تھا اور یہ پہلا اڈیشن حضرت مولانا عثمانیؒ کے تشریحی نوٹس کے ساتھ نہیں تھا بلکہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمہم اللہ کے فوائد کے ساتھ تھا۔ دوسرے اڈیشن میں مولانا عثمانیؒ کی تفسیر شائع ہوئی تھی۔ یہ اڈیشن ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ ۲۰ر رمضان ۳۸ھ کو بمبئی واپس پہنچے تھے۔ ۱۸ر ربیع الاول ۳۹ھ کو دہلی میں وفات پائی۔ وفات کے کچھ عرصہ بعد ورثاء نے قرآن پاک کے اس ترجمہ کے حقوق طبع کی فروختگی کا اعلان کیا' اس کی خریداری کے لئے استاذ گرامی مولانا خواجہ عبدالحئی۔ جامعہ ملیہ کی جانب سے تشریف لے گئے تھے' مگر یہ سعادت مولانا محمد مجید حسن صاحب بجنوری کی قسمت میں تھی' انہوں نے دل کھول کر قیمت لگائی اور اس نعمت کو حاصل کر لیا۔ خرید و فروخت کی تکمیل ۱۲ر ذیقعدہ ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۸ر جون ۱۹۲۳ء کے دن ہوئی اور طباعت کی تکمیل ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔

اس ترجمہ و تفسیر کی ساری کتابت خود ہمارے گھر میں ہوئی' کہ اس کتابت کے لئے جناب والد صاحب قبلہ منشی عبدالقیوم خاں صاحب مرحوم کا انتخاب ہوا تھا۔ انہوں نے اردو ترجمہ کی کتابت کی اور عربی متن کی کتابت استاذی منشی محمد قاسم صاحب (لدھیانوی) نے کی۔

مولانا عثمانی صاحب کے حواشی کی تکمیل ۹ر ذی الحجہ ۱۳۵۰ء کو ہوئی اور کتابت کی تکمیل ۳ر جمادی الثانی ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء کو ہوئی۔ والسلام خادمکم محمد عبدالملک

بیسویں صدی عیسوی

میں صنم کدۂ ہند میں "احیائے اسلام" کی کوششوں پر ایک اہم تاریخی دستاویز

جماعتِ شیخ الہندؒ اور تنظیمِ اسلامی

- ابوالکلامؒ امام الہند کیوں نہ بن سکے — ؟
- 'حزب اللہ' اور 'دارالارشاد' قائم کرنے کے منصوبے بنانے والا 'عبقریٔ وقت' کانگرس کی نذر کیوں ہو گیا!
- احیائے دین اور احیائے علم کی تحریکوں سے علماء کی بدظنی کیوں ؟
- کیا 'اقامتِ دین' کی جدوجہد ہمارے دینی فرائض میں شامل ہے !
- حضرت شیخ الہندؒ کیا کیا حسرتیں لے کر اس دنیا سے رخصت ہوئے ؟
- علماءِ کرام اب بھی 'متحد' ہو جائیں تو

'اسلامی انقلاب' کی منزل دُور نہیں !

✤ فرائض دینی کا جامع تصور ✤ رجم ✤ عورت کی دیت ✤ اور دیگر مسائل پر
ڈاکٹر اسرار احمد کی معرکۃ الآراء تحریروں اور خطبات کے علاوہ مورخِ اسلام
مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری، مولانا افتخار احمد فریدی، مہاجرِ کابل
قاری حمید انصاری، پروفیسر محمد اسلم، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی، مولانا
محمد زکریا، مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری اور دیگر نامور علماءِ کرام اور اہلِ علم حضرات کی تحریروں پر مشتمل تاریخی مرقع

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے مبسوط مقدمے کے ساتھ

• ضخامت ۶۵۶ صفحات (نیوز پرنٹ) • قیمت ۴۰/- روپے

'میثاق' اور 'حکمتِ قرآن' کے مستقل خریداروں کو یہ کتاب ۲۵ فیصد رعایت پر مبلغ ۳۰/- روپے
بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک پیش کی جائے گی ۔ ڈاک خرچ ادارے کے ذمے ہوگا —

نوٹ : کتاب محدود تعداد میں شائع کی گئی ہے ۔ اپنی کاپی جلد حاصل کر لیجئے —
ایسا نہ ہو کہ آپ کو دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے !

ملنے کا پتہ :

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

SEPTEMBER 1987 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 6
NO. 9

منہجِ انقلابِ نبویؐ

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے رہنما خطوط

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لیکر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل اور اسکی بین الاقوامی توسیع تک

اسلامی انقلاب کے مراحل مدارج اور لوازم

پر مشتمل

ماہنامہ "میثاق" میں شائع شدہ

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دس خطبات کا مجموعہ

قیمت: -/۲۵ روپے صفحات: ۳۴۴ (نیوز پرنٹ)

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶ ماڈل ٹاؤن لاہور